شذرات

استحکام پاکستان	منظورالحسن	۲

قرآنیات

آل عمران (۳: ۱۵۶-۱۶۴)	جاوید احمد غامدی	۷

معارف نبوی

حکمرانوں کو نصیحت کرنا	معز امجد	۱۳

دین و دانش

ایمانیات (۳)	جاوید احمد غامدی	۱۵
''اسلام اور موسیقی''ــــ ''الاعتصام'' کی تنقید پر تبصرہ	منظورالحسن	۲۴

سیر و سوانح

بنی اسرائیل میں ایک عظیم رسول کی آمد کی خبر (۲)	خالد مسعود	۶۳

یسئلون

متفرق سوالات	جاوید احمد غامدی/معظم صفدر	۶۷

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

منظور الحسن

استحکام پاکستان

۱۹۴۷ء میں ہم نے سوچا تھا کہ ہم کرۂ ارض پر ایک ایسی سلطنت قائم کر رہے ہیں جہاں اسلام اپنے پورے فلسفے اور قانون کے ساتھ نافذ العمل ہو گا۔ چشم عالم ایک مرتبہ پھر اس عدل اجتماعی کا نظارہ کرے گی جو چودہ صدیاں پہلے خلافت راشدہ کی صورت میں ظہور پذیر ہوا تھا۔ اس کا وجود ملت اسلامیہ کے لیے مرکزی ادارے کا کردار ادا کرے گا اور غیر مسلم دنیا کے لیے اسلام کی مشہود دعوت قرار پائے گا۔ اس کے حدود میں مسلمانوں کی ترقی کی راہیں کسی دوسری قوم کے تعصب سے مسدود نہیں ہوں گی۔ وہ باہم متحد ہو کر اسے اسلام کا ایک مضبوط قلعہ بنا دیں گے اور دیگر مسلمانان عالم کے لیے سہارے اور تعاون کا باعث ہوں گے۔ ہمارا خیال تھا کہ ہم ایک ایسی ریاست تشکیل دے رہے ہیں جو دور جدید میں فلاحی ریاست کے تمام تر تصورات کی آئینہ دار ہو گی۔ جہاں تفریق و امتیاز کے بغیر شہریوں کو ان کے حقوق میسر ہوں گے اور لوگ یکساں طور پر تعلیم، روزگار، صحت اور امن عامہ کی سہولتوں سے بہرہ مند ہوں گے۔ ہمارا تصور تھا کہ ہم ایک ایسا ملک معرض وجود میں لا رہے ہیں جس کا نظم سیاسی جمہوری اقدار پر مبنی ہو گا۔ اس کے عوام اپنا اجتماعی نظام خود تشکیل دیں گے اور انھیں اس میں تبدیلی کرنے اور اپنے حکمرانوں کے تقرر و تنزل کا پورا اختیار حاصل ہو گا۔

آج پاکستان کو قائم ہوئے نصف صدی سے زیادہ کا عرصہ بیت چکا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس کا وجود سلامت ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ ہمارے خواب آج بھی تشنۂ تعبیر ہیں۔ اسلام کا عدل اجتماعی اور خلافت راشدہ تو افلاک کی باتیں ہیں، ہم ان ارضی اخلاقیات تک بھی رسائی حاصل نہیں کر سکے جو دنیا میں متفق علیہ ہیں اور جن پر اسلام سے

نابلد اقوام بھی صدیوں سے عمل پیرا ہیں۔ یہ سلطنت اسلام کی تجربہ گاہ اور پھر اس کا مشہود نمونہ تو کیا بنتی، اسلام کی حیثیت عرفی کو مجروح کرنے کا باعث ضرور ہوئی ہے۔اس کے مکینوں نے اپنے قول و عمل سے اسلام کا جو تعارف پیش کیا ہے، اس کی روشنی میں اہل دنیا اسے ایک متشدد، غیر عقلی، جذباتی اور عصر حاضر سے غیر ہم آہنگ مذہب تصور کرتے ہیں۔فلاحی ریاست کے تمام تصورات بکھر چکے ہیں۔غربت اپنی انتہا کو چھو رہی ہے۔ملکی معیشت دن بہ دن روبہ زوال ہے۔بیش تر آبادی کے لیے دو وقت کے کھانے کا حصول مشکل ہوتا جا رہا ہے۔تعلیمی پس ماندگی کا یہ عالم ہے کہ تعلیم کا اصل مقصد ملازمت کا حصول بن گیا ہے۔ درس گاہوں کی حالت یہ ہے کہ فلسفہ، ادب، تاریخ، عمرانیات، اقتصادیات، ریاضی، سائنس، آرٹ اور دیگر علوم وفنون کے وہ نصابات جن سے دنیا کی ترقی یافتہ اقوام کئی عشرے پہلے گزر کر انھیں متروک قرار دے چکی ہیں، وہ ان میں کسب فیض کا ذریعہ ہیں۔لوگوں کی اکثریت کو صحت کی ابتدائی ضرورتیں بھی میسر نہیں ہیں۔اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ فلاحی ریاست کے حوالے سے ہمارا سفر آج بھی اتنا ہی باقی ہے جتنا آج سے پچاس سال پہلے تھا۔ جہاں تک جمہوریت کا تعلق ہے تو حقیقت یہ ہے کہ ہم شاید چند دنوں کے لیے بھی اس کا تجربہ نہیں کر سکے۔ نیچے سے لے کر اوپر تک ہماری جمہوری سیاست محض مفادات کی سیاست واقع ہوئی ہے۔

یہ حال ہے جو ہمارے خوابوں اور ہمارے تصورات کا ہوا ہے۔ ہمارے اجتماعی وجود کی یہ حالت اس قدر نمایاں ہے کہ کوئی بھی اس کا انکار نہیں کر سکتا۔البتہ، یہ سوال ہر شخص کے ذہن میں ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اس صورت حال کا سبب کیا ہے؟ کیا یہاں افرادی وسائل کی کمی ہے، کیا یہاں بے صلاحیت لوگ بستے ہیں، کیا یہاں کے لوگوں کو نفاذ اسلام سے کوئی دل چسپی نہیں ہے، کیا یہاں کے باشندے اپنی اور ملک کی ترقی کی خواہش سے محروم ہیں، کیا یہاں کے شہری نظم سیاسی کو اپنی منشا کے مطابق چلانے کی تمنا نہیں رکھتے؟ یا پھر یہ خطۂ ارضی آفات سماوی کا شکار ہے، یا اس کی سرزمین قدرتی وسائل سے خالی ہے؟ ان سوالوں کے جواب میں ہر شخص کہے گا کہ ایسا ہر گز نہیں ہے۔ یہ ملک افرادی وسائل سے مالا مال ہے۔قدرتی وسائل کی بھی کوئی کمی نہیں ہے۔اس سرزمین میں زراعت اور معدنیات کے حوالے سے ایسا تنوع اور تناسب پایا جاتا ہے کہ دنیا کے کم ممالک ایسی تقسیم کے حامل ہیں۔اس کے باسی صلاحیت اور جاں فشانی میں کسی سے کم نہیں ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے مسلسل جدوجہد سے ایک ایسے ملک کو قائم کیا جسے دنیا ناممکن قرار دے رہی تھی۔ ملک وملت کی بقا کے لیے جب بھی کسی نے صدا لگائی ہے، اس کے افراد نے اپنی جانیں تک پیش کرنے سے گریز نہیں کیا۔ جمہوریت کے نعرے پر ہمیشہ لبیک کہا ہے۔ اسلام سے محبت کا یہ عالم رہا ہے کہ اگر کسی

طالع آزمانے بھی اسلام کا نعرہ لگایا تو اس پر بھی لبیک کہنے سے دریغ نہیں کیا۔

اگر معاملہ یہ ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ ۵۸ برس گزرنے کے باوجود ہم منزل تک رسائی تو کیا حاصل کرتے، نشانات منزل ہی کھو بیٹھے ہیں۔ اس تمام صورت حال کا صرف ایک سبب ہے اور وہ دینی اور دنیوی امور میں ہماری جہالت ہے۔

ہم اس ملک کو اسلام کی تجربہ گاہ نہیں بنا سکے تو اس کی وجہ دین کے بارے میں ہماری جہالت ہے۔ اس جہالت کا عالم یہ ہے کہ ہمارے عوام کا تصور دین مخصوص مکاتب فکر کی فقہی آرا کی پیروی تک محدود ہے۔ کہیں کلمات نماز کے بلند آہنگ یا کم آہنگ ہونے کا مسئلہ ہے، کہیں ازار کے ٹخنوں سے اوپر یا نیچے ہونے کا معاملہ ہے، کہیں داڑھی کے لمبا یا چھوٹا ہونے کا سوال ہے، کہیں عمامے اور ٹوپی کی جنگ ہے۔ خواص کا معاملہ یہ ہے کہ وہ اسلام کی غلط تعبیرات سامنے آنے کی وجہ سے اسے ایک قصۂ پارینہ سمجھ کر دور جدید کے تقاضوں سے غیر ہم آہنگ قرار دیتے ہیں۔ جہاں تک علماے دین کا تعلق ہے تو ان کی اکثریت لوگوں کو سرگرم جنگ رکھنے پر مصر ہے۔ انھوں نے اس دوران میں کبھی اس کے لیے کوشش نہیں کی کہ لوگوں کو دین کے حقیقی شعور سے آگاہ کریں، ان کی اخلاقی تربیت کا اہتمام کریں اور انھیں حالات کے لحاظ سے حکمت عملی ترتیب دینے کی ترغیب دیں۔ اس زمانے میں بالخصوص ان کی یہ ذمہ داری تھی کہ وہ اسلام کے بارے میں جدید ذہن کے سوالات کا جائزہ لیتے اور عصر حاضر کے اسلوب میں ان کے تسلی بخش جوابات مرتب کرتے۔ المیہ یہ ہے کہ انھوں نے اس میدان میں علمی و فکری کام کرنے کے بجائے اپنی تمام تر توجہ سیاست کی حریفانہ کش مکش اور معاندانہ قوتوں کے خلاف جذباتی فضا قائم کرنے پر مرتکز رکھی ہے۔

اگر ہم اسے ایک فلاحی ریاست نہیں بنا سکے تو اس کی وجہ دنیوی امور کے بارے میں ہماری جہالت ہے۔ اپنے افراد کی عمومی تعلیم کے بارے میں ہم نے ہمیشہ غفلت اور بے اعتنائی کا رویہ اختیار کیا ہے۔ اس کے نتیجے میں ہمارے تمام طبقات بلا استثنا جہالت کا شکار ہیں۔ فلاحی ریاست کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ معاشرے کا اجتماعی نظام عادل، شفاف اور زندگی کی سہولتوں سے آراستہ ہو۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے ہم نے کبھی منصوبہ بندی نہیں کی۔ معاشرے کی ترقی کے لیے کن عوامل کی ضرورت ہوتی ہے، قانون پسندی کی کیا اہمیت ہے، اعلیٰ انسانی اقدار کس طرح اداروں میں ڈھلتی ہیں، رفاہی ادارے کس طریقے سے خدمت انجام دیتے ہیں، شہریوں کی ذمہ داریاں کیا ہوتی ہیں، ارباب حکومت کو کیا فرائض انجام دینے ہوتے ہیں، صحت، تعلیم اور روزگار کی سہولتیں بہم پہنچانے کے لیے حکومت کو کیا منصوبہ بندی کرنا ہوتی ہے اور عوام کیسے اس عمل میں شریک ہوتے ہیں، امن عامہ کے مسائل کو کیسے حل کیا جاتا ہے، ظلم و عدوان کے خاتمے اور عدل و انصاف کے قیام کے لیے کیسے لائحۂ عمل تشکیل دیا جاتا ہے؟ یہ مسائل

ہمارے فکر و عمل کا کبھی حصہ نہیں بن سکے۔ اس زمانے میں کسی قوم کی مادی ترقی کا انحصار سرتاسر اس بات پر ہے کہ وہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں کس رفتار سے آگے بڑھ رہی ہے۔ دفاع، صنعت، زراعت اور رسل و رسائل کے معاملات میں سائنس اور ٹیکنالوجی ہی کی بنیاد پر ترقی کی جاسکتی ہے۔ مگر ہماری حالت اس میدان میں نہایت ابتر ہے۔ چنانچہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہماری غربت کا اصل سبب جدید سائنسی علوم سے بے اعتنائی ہے۔ فلاحی ریاست کا تصور امن عامہ کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ اس کے قیام کے لیے ضروری تھا کہ ہم عام اخلاقیات کے شعور سے بہرہ مند ہوں۔ ہماری تربیت ہونی چاہیے تھی کہ ایک شہری کی حیثیت سے ہماری کیا ذمہ داریاں ہیں، دوسروں کے حقوق کس طرح ادا کیے جاتے ہیں، قانون کی پاس داری کے فوائد اور قانون شکنی کے کیا نقصانات ہیں، دھوکا، فریب، عناد، ہٹ دھرمی اور حق تلفی سے کس طرح انسانی شخصیات مسخ ہوتی اور پورے معاشرے کے لیے امن و امان کا مسئلہ پیدا کر دیتی ہیں۔ ان پہلووں سے ہم آج تک نہ اپنی تربیت کر سکے اور نہ اس مقصد کے لیے کوئی لائحۂ عمل تشکیل دے سکے ہیں۔

اگر ہم یہاں جمہوری اقدار کو مستحکم نہیں کر سکے تو اس کی وجہ سیاسی معاملات کے بارے میں ہماری جہالت ہے۔ ہمارے عوام کی اکثریت سیاسی شعور سے بے گانہ ہے۔ جمہوریت عوام کی سیاسی عمل میں بھرپور شرکت کا نام ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قوم کے افراد باہمی مشاورت سے اپنی ضرورتوں کا تعین کرتے، انھیں پورا کرنے کے لیے لائحۂ عمل تشکیل دیتے، اپنی تنظیم کرتے، تقسیم کار کے اصول پر اپنی ذمہ داریاں بانٹتے، اس مقصد کے لیے ادارے اور انجمنیں تشکیل دیتے اور پوری تن دہی کے ساتھ ملکی تعمیر میں سرگرم عمل ہو جاتے ہیں۔ قوم کا ہر فرد اس کام میں پورے شعور کے ساتھ شریک ہوتا ہے۔ اس کے برعکس ہمارا معاملہ یہ ہے کہ کارپرداز عناصر عوام کو فریب دیتے اور عوام بڑی آسانی سے ان کے فریب میں آجاتے ہیں۔ جس فرد یا گروہ کے ہاتھ میں اقتدار آتا ہے، وہ اس پر بالجبر قابض رہنا چاہتا ہے اور اس مقصد کے لیے جمہوری اداروں کی پامالی کی پروا بھی نہیں کرتا۔ ایسے موقعوں پر عوام نہ موثر احتجاج کر پاتے اور نہ تبدیلی حالات کے لیے صحیح خطوط پر کوئی جدوجہد کر سکتے ہیں۔ اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ بھی نہیں نکلتا کہ جمہوری ادارے بننے سے پہلے ہی ٹوٹ جاتے ہیں اور ملک پر سیاسی عدم استحکام کی فضا طاری رہتی ہے۔

اس تناظر میں ہم سمجھتے ہیں کہ ۱۹۴۷ء کے خواب کی حقیقی تعبیر کے لیے واحد راستہ تعلیم ہے۔ جب تک ہم دینی و دنیوی اعتبار سے اپنی جہالت سے چھٹکارا نہیں پا لیتے اور اس حقیقت کا ادراک نہیں کر لیتے کہ موجودہ زمانے میں تعلیم و تعلم ہی سے ترقی کے منازل طے کیے جاسکتے ہیں، اس وقت تک ہمارا یہ خواب، خواب ہی رہے گا۔

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آل عمران

(۲۶)

(گزشتہ سے پیوستہ)

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا، لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا، وَقَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ اِذَا ضَرَبُوْا فِي الْاَرْضِ اَوْ كَانُوْا غُزًّى، لَّوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا، وَمَا قُتِلُوْا لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ، وَاللّٰهُ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ، وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿١٥٦﴾ وَلَئِنْ

ایمان والو، اُن منکروں کی طرح نہ ہو جاؤ جن کے اعزہ واقربا کبھی سفر پر جاتے ہیں یا کسی جنگ کے لیے نکلتے ہیں (اور اُن کو موت آجاتی ہے) تو اُن کے بارے میں[۲۳۵] وہ کہتے ہیں کہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے اور نہ قتل ہوتے۔ یہ اِس لیے کہ اللہ اِس چیز کو اُن کے دلوں کی حسرت بنا دے[۲۳۶]، (ورنہ حقیقت یہ ہے کہ) اللہ ہی مارتا اور جلاتا ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو، وہ اللہ کی نگاہوں میں ہے۔ اور (اِس پر مزید یہ کہ)

[۲۳۵] اصل میں 'قالوا لاخوانهم' کے الفاظ آئے ہیں۔ ان میں 'ل' اسی طرح کا ہے، جس طرح سورۂ احقاف کی آیت 'وقال الذين كفروا للذين اٰمنوا'* میں آیا ہے۔

[۲۳۶] اور اس طرح ان کے اس وہم کی سزا انھیں دنیا ہی میں دے دے کہ اپنی تدبیروں سے وہ موت کو ٹال سکتے ہیں۔

* ۴۶: ۱۱۔

قُتِلْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ، اَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ﴿١٥٧﴾
وَلَئِنْ مُّتُّمْ اَوْ قُتِلْتُمْ لَاِالَى اللّٰهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿١٥٨﴾

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ، وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ، وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ، وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ، فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ،

اگر تم اللہ کی راہ میں مارے جاؤ گے یا مرو گے تو اللہ کی جو رحمت اور بخشش تمھیں حاصل ہوگی، وہ اُس سے کہیں بہتر ہے جو یہ جمع کر رہے ہیں۔ اور (یہ بھی کہ) تم مرو یا مارے جاؤ، تم کو سمٹ کر جانا بہرحال اللہ ہی کی طرف ہے[۲۳۷]۔ ۱۵۶-۱۵۸

سو یہ اللہ کی عنایت ہے[۲۳۸] کہ تم اِن کے لیے بڑے نرم خو واقع ہوئے ہو۔ اگر تم درشت خو اور سخت دل ہوتے تو یہ سب تمھارے پاس سے منتشر ہو جاتے۔ اِس لیے اِن سے درگزر کرو، اِن کے لیے مغفرت چاہو اور معاملات میں اِن سے مشورہ لیتے رہو[۲۳۹]۔ پھر جب فیصلہ کر لو تو اللہ پر بھروسا کرو[۲۴۰]،

---

[۲۳۷] یہ آیات جس رویے کو اختیار کرنے کی تلقین کرتی ہیں، اس کی وضاحت استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اس طرح فرمائی ہے:

"... یہ آیت تہور کی دعوت نہیں دے رہی ہے، بلکہ اس حقیقت سے آگاہ کر رہی ہے کہ فرائض سے فرار زندگی بچانے کی کوئی تدبیر نہیں ہے۔ آدمی کے لیے صحیح روش یہ ہے کہ جو فرض جب عائد ہو جائے، پورے عزم و جزم کے ساتھ اس کو ادا کرے اور یہ یقین رکھے کہ موت اس وقت آئے گی، جب اس کا وقت مقرر ہے اور ساتھ ہی یہ بھی یقین رکھے کہ اداے فرض کی راہ میں مرنا اس دنیا کی زندگی اور اس زندگی کے تمام اندوختوں سے کہیں زیادہ قیمتی ہے۔" (تدبر قرآن ۲/۲۰۷)

[۲۳۸] اصل میں 'فبما رحمة من اللّٰه' کے الفاظ آئے ہیں۔ ان میں 'ما' ہمارے نزدیک جملے کے آہنگ کو قائم رکھنے کے لیے آ گیا ہے۔

[۲۳۹] اس سے پہلے منافقین پر جو تنقید کی گئی ہے، اس کا اثر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں پر یہ پڑ سکتا تھا کہ سب کا رویہ ان کے بارے میں سخت ہو جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے اس مرحلے میں یہ پسند نہیں کیا۔ چنانچہ بطور التفات

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُتَوَکِّلِیْنَ ﴿۱۵۹﴾ اِنْ یَّنْصُرْکُمُ اللّٰہُ فَلَا غَالِبَ لَکُمْ، وَاِنْ یَّخْذُلْکُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِیْ یَنْصُرُکُمْ مِّنْ بَعْدِہٖ، وَعَلَی اللّٰہِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۶۰﴾

اس لیے کہ اللہ کو وہی لوگ پسند ہیں جو اُس پر بھروسا کرنے والے ہوں۔ (یادرکھو کہ) اگر اللہ تمھاری مدد پر ہو تو کوئی تم پر غلبہ نہیں پا سکتا اور وہ تمھیں چھوڑ دے تو اِس کے بعد کون ہے جو تمھاری مدد کرے گا؟ اور اِیمان والوں کو تو اللہ ہی پر بھروسا کرنا چاہیے۔[۲۴۱] ۱۵۹-۱۶۰

فرمایا ہے کہ اس سے پہلے بھی جو کریمانہ طرزعمل آپ نے اختیار کیے رکھا ہے، وہی صحیح تھا اور اب بھی آپ کی یہ روش قائم رہنی چاہیے تاکہ جن کے اندر اصلاح پذیری کی ادنیٰ گنجایش بھی باقی ہے، وہ اپنے آپ کو درست کر لیں۔ اس کے ساتھ ایک مزید ہدایت یہ فرمائی ہے کہ حسب سابق ان سے مشورہ بھی کرتے رہیے، اس لیے کہ مسلمانوں کی جماعت سے ان کے الگ کر دینے کا وقت ابھی نہیں آیا۔ ان کی مہلت باقی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے بارے میں کوئی فیصلہ آ جانے تک ان کے معاشرتی حقوق اسی طرح قائم رہنے چاہییں، جس طرح ہمیشہ سے قائم ہیں۔

اس ہدایت کا موقع یہی ہے، لیکن اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ ارباب حل وعقد کے لیے عام حالات میں پسندیدہ طریقہ نرمی، چشم پوشی اور عفو ودرگزر ہی کا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''... اسی سے افراد میں حسن ظن اور اعتماد پیدا ہوتا ہے جس سے اجتماعی نظام میں وحدت، قوت اور استحکام کی برکتیں ظہور میں آتی ہیں۔ سختی اور سخت گیری اس کی فطرت میں نہیں، بلکہ اس کے عوارض میں سے ہے۔ جس طرح صحت کے لیے اصل شے غذا ہے، لیکن کبھی کبھی کسی مرض کے علاج کے لیے دوا کی بھی ضرورت پیش آ جاتی ہے، اسی طرح اجتماعی نظام میں اصل چیز نرمی ہے، سختی کبھی کبھی ضرورت کے تحت اختیار کرنی پڑتی ہے۔''

(تدبر قرآن ۲/۲۱۰)

[۲۴۰] یعنی مشورے کے بعد جب فیصلہ کر لو تو اس کی پروا نہ کرو کہ ان میں سے کون تمھارا ساتھ دیتا ہے اور کون نہیں دیتا۔ ان کی بات مانی جائے یا نہ مانی جائے، دونوں صورتوں میں یہ نازک سے نازک موقع پر تمھیں چھوڑ کر جا سکتے ہیں۔ اس کی فکر نہ کرو، تمھارے لیے اللہ اور سچے ایمان والے ہی کافی ہیں۔

وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ، وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ، ثُمَّ تُوَفّٰى
كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ، وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۱۶۱﴾ اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ
كَمَنْۢ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ، وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ، وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۶۲﴾ هُمْ
دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ، وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶۳﴾ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى
الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ، يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ، وَيُزَكِّيْهِمْ،

(یہ سمجھتے ہیں کہ اِس جنگ کے لیے باہر نکل کر پیغمبر نے اِن سے بدخواہی کی ہے۔ ہرگز نہیں)، یہ کسی پیغمبر کے شایان شان ہی نہیں کہ بدخواہی کرے اور (اِنھیں معلوم ہونا چاہیے کہ) جو کوئی بدخواہی کرے گا، قیامت کے دن وہ اپنی اِس بدخواہی کے ساتھ ہی حاضر ہوگا۔ پھر ہر شخص کو اُس کی کمائی کا پورا پورا بدلہ مل جائے گا اور اِن کے ساتھ کوئی کمی نہ ہوگی۔ کیا وہ جو خدا کی خوش نودی چاہے، وہ اُن لوگوں کی طرح ہو جائے گا جو خدا کی ناراضی لے کر لوٹے اور جن کا ٹھکانا دوزخ ہے، اور وہ کیا ہی برا ٹھکانا ہے؟ اللہ کے نزدیک اِن کے درجے الگ الگ ہوں گے اور جو کچھ یہ کر رہے ہیں، اللہ اُسے دیکھ رہا ہے۔[۲۴۲] حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے تو مسلمانوں پر بڑا احسان فرمایا ہے کہ اُن کے اندر خود اُنھی میں سے ایک رسول اٹھایا ہے[۲۴۳] جو اُس کی آیتیں اُنھیں سناتا

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

[۲۴۱] یعنی اصلی چیز اللہ پر بھروسا ہے۔ یہ ایمان کا لازمی تقاضا ہے۔ اسباب و وسائل کی حیثیت بندۂ مومن کے لیے ہمیشہ ثانوی ہوتی ہے۔

[۲۴۲] یہ منافقین کے اس الزام کی تردید ہے جو انھوں نے احد کی شکست کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر لگایا اور جس کے ذریعے سے مسلمانوں کے اندر بددلی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”... الزام یہ تھا کہ ہم نے تو اس شخص پر اعتماد کیا، اس کے ہاتھ پر بیعت کی، اپنے نیک و بد کا اس کو مالک بنایا، لیکن یہ اس اعتماد سے بالکل غلط فائدہ اٹھا رہے ہیں اور ہمارے جان و مال کو اپنے ذاتی حوصلوں اور امنگوں کے لیے تباہ کر رہے ہیں۔ ہم نے تو واضح طور پر یہ مشورہ دیا تھا کہ شہر کے اندر رہ کر دشمن کا مقابلہ کیا جائے، لیکن انھوں نے ہمارے مشوروں کی اور ہمارے بھائیوں کی جانوں کی کوئی قدر و قیمت نہ سمجھی اور ان کو ایک بالکل نامناسب مقام میں لے جا کر دشمن سے تہ تیغ کرا دیا، یہ صریحاً قوم کی بدخواہی اور اس کے ساتھ غداری و بے وفائی ہے۔“
> (تدبر قرآن ۲/۲۱۱)

وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ، وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱۶۴﴾

ہے اور اُن کا تزکیہ کرتا ہے[۲۴۴] اور اِس کے لیے اُن کو قانون اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔[۲۴۵] اور اس میں شبہ نہیں کہ اِس سے پہلے تو وہ کھلی گمراہی میں تھے۔[۲۴۶] ۱۶۱-۱۶۴

[۲۴۳] یعنی یہ اللہ کا احسان ہے کہ اس نے یہ رسول انھی کے اندر سے اٹھایا ہے تاکہ کسی نوعیت کی کوئی اجنبیت ان کے اور اس رسول کی دعوت کے مابین رکاوٹ نہ بنے اور اس کی آواز کو یہ خود اپنے ضمیر کی آواز کی طرح پہچانیں اور سنیں۔

[۲۴۴] یہ اسی احسان کا دوسرا پہلو ہے کہ اس رسول کے ذریعے سے جو دعوت پیش کی جا رہی ہے، وہ ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو پاکیزہ بنانے کی دعوت ہے۔ پھر اس سے بڑھ کر ان کے حق میں نصح و خیر خواہی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے؟ اس مفہوم کے لیے عربی زبان کا جو لفظ قرآن نے اختیار کیا ہے، وہ تزکیہ ہے۔ اس کے معنی کسی چیز کو آلایشوں سے پاک کرنے کے بھی ہیں اور نشو و نما دینے کے بھی۔ انبیا علیہم السلام انسانوں کو جس قانون و حکمت کی تعلیم دیتے ہیں، اس سے یہ دونوں ہی چیزیں حاصل ہوتی ہیں۔

[۲۴۵] اصل میں 'یعلمھم الکتاب والحکمۃ' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ 'الکتاب' قرآن کی زبان میں جس طرح خط اور کتاب کے معنی میں آتا ہے، اسی طرح قانون کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔ قرآن کے نظائر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اور 'الحکمۃ' جب اس طرح عطف ہو کر آتے ہیں تو 'الکتاب' سے شریعت اور 'الحکمۃ' سے دین کی حقیقت اور ایمان و اخلاق کے مباحث مراد ہوتے ہیں۔

[۲۴۶] یہ احسان کا تیسرا پہلو ہے کہ جن لوگوں میں اس پیغمبر کی بعثت ہوئی ہے، وہ گمراہیوں میں بھٹک رہے تھے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان پر کرم فرمایا اور گمراہی سے نکال کر ہدایت کی سیدھی راہ پر گامزن کر دیا۔

اس مفہوم کے لیے اصل میں 'وان کانوا من قبل لفی ضلال مبین' کے الفاظ آئے ہیں۔ ان میں 'ان' درحقیقت 'انّ' ہے جس پر 'ل' دلالت کر رہا ہے۔

[باقی]

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

معز امجد

حکمرانوں کو نصیحت کرنا

روی[1] أن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال: من کانت عندہ نصیحۃ لذی سلطان فلا یکلمہ بہا علانیۃ ولیأخذ بیدہ فلیخل بہ فإن قبلہا قبلہا وإلا کان قد أدی الذی علیہ والذی لہ.[2]

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

''روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص کے پاس حکمران کے لیے نصیحت کی کوئی بات ہو تو اسے سب کے سامنے اس سے یہ بات نہیں کہنی چاہیے،[1] بلکہ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کے اسے علیحدگی میں لے جائے (اور پھر اس سے وہ بات کہے)۔ (یہ نصیحت سننے کے بعد) اگر وہ اسے قبول کرے تو اس نے قبول کیا (بہتری کے لیے) اور اگر وہ اسے قبول نہ کرے تو نصیحت کرنے والے نے اپنی ذمہ داری پوری کر دی[2] اور حکمران کو اس کا حق ادا کر دیا[3]۔''

ترجمے کے حواشی

۱۔ یعنی نصیحت کرنے والے کو نہایت دانش مندی سے کام لیتے ہوئے حکمران کو سب کے سامنے تنقید کا نشانہ

بنانے اور سب کے سامنے اس کا مذاق اڑانے کے بجائے علیحدگی میں اسے نصیحت کرنی چاہیے تاکہ یہ نصیحت اس پر گراں نہ گزرے اور اگر اس پر تنقید کی جارہی ہو تو تنہائی میں اسے اپنی اصلاح کا موقع ملے۔

۲۔ یعنی نصیحت حکمران کے لیے نصیحت ہی ہونی چاہیے اپنی بات منوانے کے لیے اسے مجبور نہیں کرنا چاہیے۔ حکمران اگر سمجھے کہ نصیحت کرنے والے کی نصیحت اچھی اور قابل عمل ہے تو اسے اپنی اور لوگوں کی بہتری کے لیے اسے قبول کرنا چاہیے اور اگر وہ کسی وجہ سے نصیحت رد کر دے تو ناصح کو اسے اپنی انا کا مسئلہ نہیں بنانا چاہیے، بلکہ اسے اطمینان رکھنا چاہیے کہ اس نے اپنی ذمہ داری ادا کر دی ہے۔

۳۔ یہ ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے اردگرد کے لوگوں کو دیکھے کہ اگر وہ کسی وجہ سے کوئی غلطی کر رہے ہیں تو وہ ان کو اس سے خبردار کرے۔ اسی طرح جو شخص حکمرانوں تک رسائی رکھتا ہو اور ان کو نصیحت کر سکتا ہو تو اسے ان کو سمجھانے کی ذمہ داری ضرور ادا کرنی چاہیے۔ اس پر یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ اس کے اوپر حکمرانوں کا یہ ایسا حق ہے کہ جس کے بارے میں وہ آخرت میں خدا اور حکمرانوں کے آگے جواب دہ ہوگا۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

متن کے حواشی

۱۔ یہ روایت بعض اختلافات کے ساتھ درج ذیل مقامات پر نقل ہوئی ہے:
سنن البیہقی، رقم ۱۶۴۳۷۔ مسند الشامیین، رقم ۱۸۷۴۔ المعجم الکبیر، رقم ۱۰۰۷۔

۲۔ مسند الشامیین، رقم ۱۸۷۴ میں 'و إلا كان قد أدى الذي عليه والذي له' (اگر وہ اسے قبول نہ کرے تو نصیحت کرنے والے نے اپنی ذمہ داری پوری کر دی اور حکمران کو اس کا حق ادا کر دیا)۔ کے بجائے 'و إلا كان قد أدى الذي له والذي عليه' (اگر وہ اسے قبول نہ کرے تو نصیحت کرنے والے نے حکمران کو اس کا حق دے دیا اور اپنی ذمہ داری پوری کر دی) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

تخریج: محمد اسلم نجمی
کوکب شہزاد
ترجمہ و ترتیب: اظہار احمد

جاوید احمد غامدی

ایمانیات

(۳)

(گزشتہ سے پیوستہ)

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

علمی تواتر

یہ شواہد اگرچہ کافی تھے، مگر لوگوں پر اتمام حجت کے لیے اللہ تعالیٰ نے مزید اہتمام یہ فرمایا کہ انسانیت کی ابتدا ایک ایسے انسان سے کی جس نے خدا کی بات سنی، اس کے فرشتوں کو دیکھا اور اس طرح حقیقت کے براہ راست مشاہدے کی گواہی دے کر دنیا سے رخصت ہوا تا کہ اس کا یہ علم نسلاً بعد نسلٍ اس کی ذریت کو منتقل ہوتا رہے اور خدا اور آخرت کا تصور انسانی زندگی کے کسی دور، زمین کے کسی خطے، کسی بستی، کسی پشت اور کسی نسل کے لیے کبھی اجنبی نہ ہونے پائے۔ قرآن کا بیان ہے کہ آدم و حوا کی تخلیق کے بعد ان سے برتر بعض مخلوقات کو حکم دیا گیا کہ ان کے سامنے سجدہ ریز ہو جائیں۔ اس سے ان کو یہ بتانا مقصود تھا کہ اصلی سرفرازی نور یا نار سے پیدا ہونے میں نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرماں برداری میں ہے۔ قرآن نے بتایا ہے کہ اس حکم کی تعمیل میں فرشتے اور جنات سب سجدہ ریز ہو گئے، مگر ابلیس نہیں مانا اور اس نے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد آدم و حوا، دونوں کو ایک باغ میں رہنے کے لیے کہا گیا جہاں زندگی کی تمام ضرورتیں مہیا تھیں، مگر ایک درخت کا پھل ان کے لیے ممنوع قرار دیا گیا۔ یہ وہی شجرۂ تناسل تھا جس کا پھل دنیا میں ہماری بقا کا ذریعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے انھیں روکا اور متنبہ کر دیا کہ ابلیس تمھارا کھلا ہوا دشمن ہے، وہ لازماً تمھیں نافرمانی پر آمادہ کرنے کی کوشش کرے گا۔ چنانچہ یہی ہوا اور ابلیس نے ایک

ناصح مشفق اور خیر خواہ کے بھیس میں آ کران سے کہا کہ حیات جاوداں اور ابدی بادشاہی کا راز اسی درخت کے پھل میں ہے جس سے تمھیں محروم کر دیا گیا ہے۔ ابلیس کی اس ترغیب وتحریص سے وہ آمادہ ہوئے اور اس پھل کی خواہش میں جو غیر معمولی ہیجان انسان پر طاری ہو جاتا ہے، اس سے مغلوب ہو کر اسے کھا بیٹھے۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ زندگی میں جو سب سے بڑا امتحان انھیں پیش آئے گا، وہ انانیت اور جنسی جبلت کے راستے ہی سے پیش آئے گا۔ چنانچہ حکم دیا گیا کہ اس باغ سے نکل کر زمین میں اتر جاؤ۔ اس پر آدم کو ندامت ہوئی اور وہ اپنے پروردگار کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ان کے اس رجوع کو دیکھ کر اللہ نے انھیں توبہ کی توفیق دی، اس کے لیے نہایت موزوں الفاظ خود القا فرمائے اور ان کی توبہ قبول کر لی۔ ارشاد فرمایا ہے:

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ: اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ، فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ، اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ، وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ. وَقُلْنَا: يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ، وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا، وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ، فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ. فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا، فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ، وَقُلْنَا: اهْبِطُوْا، بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ، وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ، فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ، فَتَابَ عَلَيْهِ، اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ. (البقرہ ۲: ۳۴۔۳۷)

”اور وہ واقعہ بھی انھیں سناؤ، جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو وہ سجدہ ریز ہو گئے، لیکن ابلیس نہیں مانا۔ اُس نے انکار کیا اور اکڑ بیٹھا اور اس طرح منکروں میں شامل ہوا۔ اور ہم نے آدم سے کہا: تم اور تمھاری بیوی، دونوں اس باغ میں رہو اور اس میں سے جہاں سے چاہو، فراغت کے ساتھ کھاؤ۔ ہاں، البتہ تم دونوں اس درخت کے پاس نہ جانا ورنہ ظالم قرار پاؤ گے۔ پھر شیطان نے ان کو وہاں سے پھسلا دیا اور جس حالت میں وہ تھے، اس سے انھیں نکلوا کر چھوڑا۔ اور ہم نے کہا: (یہاں سے) اتر جاؤ، اب تم ایک دوسرے کے دشمن ہو اور تمھیں ایک خاص وقت تک زمین پر ٹھیرنا ہے اور وہیں گزر بسر کرنی ہے۔ پھر آدم نے اپنے پروردگار سے (توبہ کے) چند الفاظ سیکھ لیے (اور اُن کے ذریعے سے توبہ کی) تو اُس کی توبہ اُس نے قبول کر لی۔ بے شک، وہ بڑا معاف فرمانے والا ہے، اس کی شفقت ابدی ہے۔“

پھر یہی نہیں، آدم وحوا کو دنیا میں بھیجنے کے بعد بھی ایک عرصے تک یہ اہتمام کیا گیا کہ بنی آدم اگر اپنے ایمان وعمل کی قبولیت یا عدم قبولیت اسی دنیا میں جاننا چاہیں تو جان لیں۔ یہ حقیقت کو اس زمانے کے ہر شخص کے لیے گویا تجربے اور

مشاہدے کے درجے تک پہنچا دینا تھا تا کہ اپنے ماں باپ کے ساتھ وہ بھی اس گواہی میں شامل ہو جائے۔ سورۂ آل عمران (۳) کی آیت ۱۸۳ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی صورت یہ ہوتی تھی کہ لوگ اللہ تعالیٰ کے حضور قربانی پیش کرتے، پھر آسمان سے ایک آگ اترتی اور قبولیت کی علامت کے طور پر اسے کھا لیتی تھی۔ آدم کے بیٹے ہابیل کا قتل اسی طرح کے ایک واقعے کے نتیجے میں ہوا تھا۔ بائیبل کا بیان ہے کہ ہابیل بھیڑ بکریوں کا چرواہا اور قابیل کسان تھا۔ ایک دن قابیل اپنے کھیت کے پھل کا ہدیہ خدا کے حضور میں لایا اور ہابیل اپنی بھیڑ بکریوں کے کچھ پہلوٹھے بچوں کا اور کچھ ان کی چربی کا ہدیہ لایا۔ یہ ہدیے پیش کیے گئے تو ہابیل اور اس کا ہدیہ قبول کر لیا گیا، لیکن قابیل اور اس کا ہدیہ قبول نہیں کیا گیا۔ اس پر قابیل نہایت غضب ناک ہوا اور اس نے اپنے بھائی کو قتل کر دیا[۴]۔ قرآن میں یہ واقعہ اس طرح بیان ہوا ہے:

وَاتۡلُ عَلَيۡهِمۡ نَبَاَ ابۡنَیۡ اٰدَمَ بِالۡحَقِّ، اِذۡ قَرَّبَا قُرۡبَانًا، فَتُقُبِّلَ مِنۡ اَحَدِهِمَا، وَلَمۡ يُتَقَبَّلۡ مِنَ الۡاٰخَرِ. قَالَ: لَاَقۡتُلَنَّكَ قَالَ: اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الۡمُتَّقِيۡنَ، لَئِنۡۢ بَسَطْتَّ اِلَیَّ يَدَكَ لِتَقۡتُلَنِیۡ مَاۤ اَنَا بِبَاسِطٍ يَّدِیَ اِلَيۡكَ لِاَقۡتُلَكَ، اِنِّیۡۤ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الۡعٰلَمِيۡنَ. اِنِّیۡۤ اُرِيۡدُ اَنۡ تَبُوۡٓاَ بِاِثۡمِیۡ وَاِثۡمِكَ فَتَكُوۡنَ مِنۡ اَصۡحٰبِ النَّارِ، وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِيۡنَ، فَطَوَّعَتۡ لَهٗ نَفۡسُهٗ قَتۡلَ اَخِيۡهِ، فَقَتَلَهٗ فَاَصۡبَحَ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ. (المائدہ ۵: ۲۷۔۳۰)

’’اور انھیں آدم کے دو بیٹوں کی سرگزشت بھی ٹھیک ٹھیک سنا دو، جب اُن دونوں نے قربانی پیش کی تو اُن میں سے ایک کی قربانی قبول کی گئی اور دوسرے کی قبول نہیں کی گئی۔ اس نے کہا: میں تجھے مار ڈالوں گا۔ اس نے جواب دیا: اللہ تو صرف اپنے پرہیزگار بندوں کی قربانی قبول کرتا ہے۔ اگر تم مجھے قتل کرنے کے لیے ہاتھ اٹھاؤ گے تو میں تمھارے قتل کے لیے ہاتھ اٹھانے والا نہیں ہوں۔ میں اللہ رب العلمین سے ڈرتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ میرا اور اپنا گناہ تمھی سمیٹ لو اور دوزخی بن کر رہو اور یہی ظالموں کی سزا ہے۔ بالآخر اس کے نفس نے اسے بھائی کے قتل پر آمادہ کر لیا اور وہ (اُسے مار کر) نامرادوں میں شامل ہو گیا۔‘‘

www.javedahmadghamidi.net
www.ghamidi.net

نبیوں کی تصدیق

اس اہتمام کے باوجود جب لوگوں نے حق سے انحراف کیا تو اللہ تعالیٰ نے بنی آدم میں سے بعض نفوس قدسیہ کو

۴؎ پیدائش ۴: ۱۔۱۲۔

نبوت عطا فرمائی تا کہ اپنے پروردگار سے الہام پا کر وہ ان کے لیے حق کی گواہی دیں۔ اللہ کے یہ نبی اپنے علم و عمل میں حق کا نمونہ بن کر نہ ماننے والوں کو ان کے انجام پر متنبہ کرتے اور ماننے والوں کو خدا کی ابدی بادشاہی کی بشارت دیتے تھے۔ ان نبیوں کے ساتھ کتابیں بھی نازل کی گئیں تا کہ لوگ ان کے ذریعے سے اپنے اختلافات کا فیصلہ کر لیں اور حق کے معاملے میں ٹھیک انصاف پر قائم ہو جائیں:

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً، فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ، وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ. (البقرہ ۲: ۲۱۳)

’’لوگ ایک ہی امت تھے۔ (اُن میں اختلاف پیدا ہوا) تو اللہ نے نبی بھیجے بشارت دیتے اور انذار کرتے ہوئے اور اُن کے ساتھ قول فیصل کی صورت میں اپنی کتاب نازل کی تا کہ لوگوں کے درمیان وہ اُن کے اختلافات کا فیصلہ کر دے۔‘‘

تجرباتی شہادت

ان نبیوں میں سے بعض کو رسالت کے منصب پر فائز کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں غیر معمولی معجزات دیے، روح القدس سے ان کی تائید کی، پھر قیامت سے پہلے ایک قیامت صغریٰ ان کے ذریعے سے اسی دنیا میں برپا کر دی۔ اس سے مقصود یہ تھا کہ خدا اور آخرت کا تصور بھی اسی معیار پر ثابت کر دیا جائے، جس معیار پر سائنسی حقائق معمل (Laboratory) کے تجربات سے ثابت کیے جاتے ہیں۔ اس کے بعد، ظاہر ہے کہ کسی کے پاس کوئی عذر اللہ کے حضور میں پیش کرنے کے لیے باقی نہیں رہ سکتا تھا۔

اس کا طریقہ یہ اختیار کیا گیا کہ ان رسولوں نے حق کی دعوت پیش کی، پھر اعلان کیا کہ اپنی قوم کے لیے وہ خدا کی عدالت بن کر آئے ہیں۔ ایمان و عمل کی بنیاد پر جزا و سزا کے جس معاملے کی خبر دی گئی ہے، وہ ان کی قوم کے ساتھ اسی دنیا میں ہونے والا ہے۔ طبعی قوانین جس طرح اٹل ہیں اور ہر حال میں نتیجہ خیز ہو جاتے ہیں، خدا کا اخلاقی قانون بھی ان کی طرف سے اتمام حجت کے بعد اسی طریقے سے نتیجہ خیز ہو جائے گا۔ لہٰذا ان کی قوم کے جو لوگ ان کی دعوت قبول کریں گے، وہ دنیا اور آخرت، دونوں میں نجات پائیں گے اور ان کے مخالفین پر انھیں غلبہ حاصل ہو گا۔ اور جو نہیں کریں گے، وہ ذلیل ہوں گے اور ان پر خدا کا عذاب آ جائے گا۔

یہ پیشین گوئی جس وقت اور جس قوم میں بھی کی گئی، اس سے زیادہ ناممکن الوقوع اور ناقابل یقین کوئی چیز نہیں تھی، لیکن تاریخ کا حیرت انگیز واقعہ ہے کہ یہ ہر مرتبہ پوری ہوئی اور اس طرح پوری ہوئی کہ لوگوں نے خدا کو عدالت

www.javedahmadghamidi.com

کرتے ہوئے دیکھا اور زمین و آسمان اس کے جلال سے معمور ہو گئے۔ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ[۵]، میں قرآن نے یہی حقیقت بیان کی ہے۔ پھر بطور قاعدۂ کلیہ فرمایا ہے:

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ، فَاِذَا جَآءَ رَسُوْلُهُمْ، قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ، وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ. (یونس ۱۰: ۴۷)

''ہر قوم کے لیے ایک رسول ہے۔ پھر جب اُن کا وہ رسول آجائے تو اُن کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جاتا ہے اور اُن پر کوئی ظلم نہیں کیا جاتا۔''

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی مرتبہ یہ معاملہ قوم نوح کے ساتھ ہوا۔ سیدنا نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو خبر دار کیا کہ اگر شرک سے تائب ہو کر وہ خالص اللہ ہی کی بندگی نہیں کرتے تو عنقریب ایک ایسے عذاب سے دوچار ہو جائیں گے جو انھیں صفحۂ ہستی سے مٹا دے گا۔ قوم کے سرداروں نے کہا: تمھاری یہی باتیں ہیں جن کی بنا پر ہم تمھیں کھلی گم راہی میں دیکھ رہے ہیں۔ تم نے ہمارے باپ دادا کی تحقیر کی ہے اور اب ہمارے اوپر عذاب الٰہی کی دھمکی بھی سنا رہے ہو۔ تمھارے پیرو بھی ہمارے نچلے طبقوں کے لوگ ہی ہیں جو بے سمجھے بوجھے تمھارے پیچھے لگ گئے ہیں۔ نوح علیہ السلام نے جواب میں فرمایا کہ یہ تمھاری بدقسمتی ہے کہ تم مجھے بھٹکا ہوا آدمی سمجھ رہے ہو۔ میں تمھارے پاس خدا کے پیغمبر کی حیثیت سے آیا ہوں اور جو کچھ تمھیں سنا رہا ہوں، وہ بے کم و کاست خدا ہی کی طرف سے سنا رہا ہوں۔ یہ خدا کا پیغام بھی ہے اور میری طرف سے تمھارے حق میں انتہائی خیر خواہی بھی۔ تمھاری ضد، ہٹ دھرمی، ناقدری، دل آزاری اور دشمنی و بیزاری کے باوجود میں یہ پیغام تمھیں سنا رہا ہوں تو اس کا محرک اس کے سوا کچھ نہیں کہ مجھے یہ اندیشہ اور غم لاحق ہے کہ تم کہیں خدا کی پکڑ میں نہ آجاؤ۔

قرآن کا بیان ہے کہ کم و بیش ساڑھے نو سو سال تک اسی دردمندی کے ساتھ وہ اپنی قوم کو متنبہ کرتے رہے۔ لیکن اس طویل جدوجہد کے بعد بھی جب قوم نے ان کی تکذیب کر دی اور اپنے رویے کی اصلاح پر آمادہ نہیں ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ ایک کشتی بنائی جائے۔ یہ قوم کے لیے گویا الٹی میٹم تھا کہ کشتی کی تکمیل کے ساتھ ہی اس کا پیمانۂ عمر بھی لبریز ہو جائے گا۔ چنانچہ کشتی بن گئی اور ماننے والے اس میں سوار ہو گئے تو ایک عظیم طوفان ابل پڑا۔ زمین کو حکم دیا گیا کہ اپنا سارا پانی اگل دے اور آسمان کو حکم دیا گیا کہ اپنا سارا پانی برسا دے۔ پھر جو نشان مقرر کر دیا گیا تھا، پانی اس پر جا کر ٹھیر گیا اور پوری قوم اس میں غرق ہو گئی۔ یہاں تک کہ نوح علیہ السلام کا بیٹا کنعان بھی اپنی ہٹ دھرمی کے باعث اس کی نذر ہو گیا۔ یہ ایک عبرت انگیز منظر تھا۔ طوفانی ہوائیں چل رہی تھیں۔ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ پہاڑوں

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

۵۔ النساء ۴: ۱۶۵۔ ''تاکہ ان رسولوں کے بعد لوگوں کے لیے کوئی عذر اللہ کے حضور میں پیش کرنے کے لیے باقی نہ رہے۔''

کی طرح موجیں اٹھ رہی تھیں۔ نوح کی کشتی ان کے تھپیڑوں سے نبرد آزما تھی کہ اتنے میں باپ نے دیکھا کہ سامنے بیٹا حیران و ششدر کھڑا ہے۔ اس کو دیکھ کر شفقت پدری نے جوش مارا، پکار اٹھے کہ جان پدر، اب بھی موقع ہے، ان منکروں کو چھوڑ کر کشتی میں سوار ہو جاؤ۔ لیکن اس ہول ناک منظر کو دیکھ کر بھی اس کی ضد میں کچھ فرق نہیں آیا۔ اس نے کہا: میں کسی پہاڑ کی پناہ لے لوں گا۔ نوح علیہ السلام نے کہا: یہ پانی نہیں، قہر الٰہی ہے۔ اس سے خدا کے سوا آج کوئی بچانے والا نہیں ہو سکتا۔ یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ اچانک ایک موج اٹھی اور بیٹے کو بہا لے گئی۔ نوح علیہ السلام کی قوم کے تمام منکرین اسی انجام کو پہنچے۔ خدا کی عدالت کا یہ بے لاگ فیصلہ تھا۔ اس سے محفوظ صرف وہی رہے جو ماننے والے تھے۔[٦]

یہ پہلی قیامت تھی جو خدا اور آخرت کے تصور کو اتمام حجت کے درجے تک مبرہن کر دینے کے لیے برپا کی گئی۔ اس کے بعد یہی معاملہ دنیا کی ہر قوم کے ساتھ ہوا۔ عاد، ثمود، قوم لوط، قوم شعیب، قوم یونس اور اس طرح کی بعض دوسری قوموں کے جو واقعات قرآن میں بیان ہوئے ہیں، وہ اسی کی مثالیں ہیں۔ ارشاد فرمایا ہے:

www.javedahmadghamidi.com

اَلَمْ یَاْتِکُمْ نَبَؤُا الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ، قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ، وَالَّذِیْنَ مِنْ بَعْدِھِمْ، لَا یَعْلَمُھُمْ اِلَّا اللّٰہُ، جَآءَتْھُمْ رُسُلُھُمْ بِالْبَیِّنٰتِ فَرَدُّوْٓا اَیْدِیَھُمْ فِیْٓ اَفْوَاھِھِمْ، وَقَالُوْٓا: اِنَّا کَفَرْنَا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِہٖ، وَاِنَّا لَفِیْ شَکٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَنَآ اِلَیْہِ مُرِیْبٍ. قَالَتْ رُسُلُھُمْ: اَفِی اللّٰہِ شَکٌّ، فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، یَدْعُوْکُمْ لِیَغْفِرَ لَکُمْ مِّنْ ذُنُوْبِکُمْ، وَیُؤَخِّرَکُمْ اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی، قَالُوْٓا: اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا، تُرِیْدُوْنَ اَنْ تَصُدُّوْنَا عَمَّا کَانَ یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا، فَاْتُوْنَا بِسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ. قَالَتْ

”تمھیں اُن لوگوں کے حالات نہیں پہنچے جو تم سے پہلے گزرے ہیں؟ قوم نوح اور عاد و ثمود کے حالات اور جو اُن کے بعد ہوئے ہیں، جنھیں اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا؟ اُن کے رسول اُن کے پاس کھلی ہوئی نشانیاں لے کر آئے تو انھوں نے اپنے ہاتھ اُن کے منہ پر رکھ دیے، اور کہا کہ جو پیغام تمھیں دے کر بھیجا گیا ہے، ہم اُسے نہیں مانتے اور جس چیز کی طرف تم بلا رہے ہو، اس کے بارے میں ہم ایسے شبہات رکھتے ہیں جو سخت الجھن میں ڈال دینے والے ہیں۔ اُن کے رسولوں نے کہا: کیا تمھیں اللہ کے بارے میں شبہ ہے جو زمین و آسمان کا خالق ہے؟ وہ تمھیں بلاتا ہے تاکہ تمھارے گناہ معاف کرے اور تمھیں ایک مقرر

---

٦ الاعراف ۷: ۵۹-۶۴۔ یونس ۱۰: ۷۱-۷۳۔ ہود ۱۱: ۲۵-۴۹۔ المومنون ۲۳: ۲۳-۳۱۔ الشعراء ۲۶: ۱۰۵-۱۲۲۔ العنکبوت ۲۹: ۱۴-۱۵۔ الصافات ۳۷: ۷۵-۸۲۔ القمر ۵۴: ۹-۱۶۔

لَهُمْ رُسُلُهُمْ: اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ، وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ، وَمَا كَانَ لَنَآ اَنْ نَّاْتِيَكُمْ بِسُلْطٰنٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ...وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ: لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا، فَاَوْحٰى اِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ: لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِيْنَ، وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ مِنْ بَعْدِهِمْ، ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِيْ وَخَافَ وَعِيْدِ. (ابراہیم ۱۴: ۹۔۱۴)

وقت کے لیے مہلت دے۔ انھوں نے کہا: تم تو ہمارے ہی جیسے آدمی ہو۔ تم چاہتے ہو کہ ہمیں اُن ہستیوں کی عبادت سے روک دو جنھیں ہمارے باپ دادا پوجتے آئے ہیں تو ہمارے پاس کوئی کھلا ہوا معجزہ لاؤ۔ اُن کے رسولوں نے جواب دیا کہ ہم ہیں تو تمھارے ہی جیسے آدمی، لیکن اللہ اپنے بندوں میں سے جن پر چاہتا ہے، اپنی عنایت فرماتا ہے، اور یہ ہمارے اختیار میں نہیں کہ ہم تمھارے پاس کوئی معجزہ لا دیں۔ اس طرح کا معجزہ تو اللہ کے اذن ہی سے آ سکتا ہے... بالآخر ان منکروں نے اپنے رسولوں سے کہا: ہم تمھیں اس سرزمین سے نکال دیں گے یا تمھیں ہماری ہی ملت میں واپس آنا ہوگا۔ تب اُن کے پروردگار نے انھیں وحی بھیجی کہ ہم ان ظالموں کو ہلاک کر دیں گے اور ان کے بعد تمھیں اس سرزمین میں آباد کریں گے۔ یہ (بشارت ہے) اُن کے لیے جو میرے حضور میں پیشی کا خوف رکھتے ہوں اور میری وعید سے ڈرتے ہوں۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

موسیٰ علیہ السلام کا قصہ بھی اسی دینونت کی سرگزشت ہے۔ فرعون اور اس کے اعیان و اکابر کے سامنے جب انھوں نے اپنی دعوت پیش کی اور وہ اسے ماننے کے لیے تیار نہیں ہوئے تو انھوں نے مطالبہ کیا کہ اپنی قوم کے ساتھ وہ اس سرزمین سے ہجرت کرنا چاہتے ہیں، انھیں جانے دیا جائے۔ فرعون نے جس طرح ان کی دعوت قبول نہیں کی، اسی طرح ان کا یہ مطالبہ بھی ماننے سے انکار کر دیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے پے در پے اپنی تنبیہات نازل کیں جن کے نتیجے میں وہ بڑی مشکل سے آمادہ ہوا کہ چند روز کے لیے انھیں جانے کی اجازت دے دے۔ لیکن جب موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو لے کر روانہ ہوئے تو اس کی نیت تبدیل ہو گئی اور اپنی فوجوں کے ساتھ وہ ان کے تعاقب میں نکل کھڑا ہوا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ انھیں مجبور کر کے واپس لے آئے گا۔ مگر اب فیصلے کا وقت آ چکا تھا۔ لہٰذا یہ فیصلہ صادر ہوا اور اس

شان کے ساتھ صادر ہوا کہ بنی اسرائیل کو گویا خدا نے اپنی آغوش میں لے کر دریا پار کرا دیا اور اپنے وقت کا یہ باجبروت بادشاہ اسی دریا میں اپنے لشکروں سمیت غرق ہوا[7]۔ پھر قدرت کی اس عظیم نشانی کے اندر ایک دوسری عظیم نشانی یہ ظاہر ہوئی کہ اس کی لاش کو سمندر نے قبول نہیں کیا اور ایک نشان عبرت بنانے کے لیے باہر پھینک دیا تا کہ زبان حال سے وہ ہر دور کے فرعونوں کو متنبہ کرتی رہے:

وَجٰوَزْنَا بِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُوْدُهٗ بَغْيًا وَّعَدْوًا، حَتّٰٓى اِذَآ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ، قَالَ: اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِيْلَ، وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ. آٰلْئٰنَ، وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ، فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً، وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰيٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ. (یونس ۱۰: ۹۰۔۹۲)

''اور بنی اسرائیل کو ہم نے سمندر پار کرا دیا تو فرعون اور اس کی فوجوں نے سرکشی اور زیادتی کے ساتھ اُن کا پیچھا کیا۔ یہاں تک کہ جب فرعون ڈوبنے لگا تو بول اٹھا: میں نے مان لیا کہ اس ہستی کے سوا کوئی الٰہ نہیں جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں اور میں بھی اس کے فرماں برداروں میں سے ہوں۔ اب مانتے ہو، حالانکہ اس سے پہلے تم نافرمانی کرتے رہے اور فساد برپا کرنے والوں میں سے تھے! اس وقت تو ہم تیری لاش ہی کو بچائیں گے تاکہ اپنے بعد والوں کے لیے تو نشان عبرت بنے، اور حقیقت یہ ہے کہ بہت سے لوگ ہماری نشانیوں سے غافل ہی رہتے ہیں۔''

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی بعثت کے بعد اس سے آگے ایک معاملہ یہ ہوا کہ ذریت ابراہیم کو بھی اللہ تعالیٰ نے قیامت تک کے لیے اسی دینونت کا نمونہ بنا دیا۔ چنانچہ اعلان کیا گیا کہ یہ اگر حق پر قائم ہو اور اسے بے کم و کاست اور پوری قطعیت کے ساتھ دنیا کی سب قوموں تک پہنچاتی رہے تو ان کے نہ ماننے کی صورت میں اللہ تعالیٰ ان قوموں پر اسے غلبہ عطا فرمائیں گے اور اس سے انحراف کرے تو انھی کے ذریعے سے ذلت اور محکومی کے عذاب میں مبتلا کر دیں گے۔ تین و زیتون، طور سینین اور مکہ کا شہر امین اسی دینونت کے مقامات ظہور ہیں۔ سیدنا مسیح علیہ السلام کے اٹھائے جانے کے بعد ان کے منکرین پر عذاب کا فیصلہ جس پہاڑ پر سنایا گیا، وہ زیتون ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ بنی اسرائیل

---

[7] اس کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو: الاعراف ۷: ۱۰۳۔ ۱۳۶۔ یونس ۱۰: ۷۵۔ ۸۹۔ بنی اسرائیل ۱۷: ۱۰۱۔ ۱۰۳۔ طٰہٰ ۲۰: ۴۰۔ ۷۹۔ المومنون ۲۳: ۴۵۔ ۴۸۔ الشعراء ۲۶: ۱۰۔ ۶۸۔ القصص ۲۸: ۳۶۔ ۴۰۔ الصّٰفّٰت ۳۷: ۱۱۴۔ ۱۱۹۔ الزخرف ۴۳: ۴۶۔ ۵۶۔ الذاریات ۵۱: ۳۸۔ ۴۰۔ النازعات ۷۹: ۱۵۔ ۲۶۔

پر اب ہمیشہ کے لیے مسیح کو ماننے والوں کا غلبہ ہوگا[8] اور وقتاً فوقتاً ایسے لوگ ان پر مسلط ہوتے رہیں گے جو انھیں نہایت برے عذاب چکھائیں گے۔[9] تین اسی کوہ زیتون پر واقع ایک گاؤں ہے۔ لوقا میں ہے کہ مسیح علیہ السلام جب یروشلم آئے تو شہر میں داخل ہونے سے پہلے اس جگہ ٹھیرے۔[10] جبل طور کے بارے میں معلوم ہے کہ بنی اسرائیل نے بحیثیت امت اپنی زندگی اسی پہاڑ سے شروع کی۔ ام القریٰ مکہ سے ذریت ابراہیم کی دوسری شاخ، بنی اسمٰعیل نے اپنی قومی زندگی کا آغاز کیا اور خدا کی زمین پر اس کی عبادت کے اولین مرکز بیت الحرام کی تولیت انھیں عطا کی گئی۔ قرآن نے ان کی شہادت پیش کر کے فرمایا ہے کہ ان مقامات پر ذریت ابراہیم کی جزا و سزا کو دیکھنے کے بعد وہ کیا چیز ہے جو قیامت میں خدا کی جزا و سزا کو جھٹلا سکتی ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

وَالتِّيۡنِ وَالزَّيۡتُوۡنِ، وَطُوۡرِ سِيۡنِيۡنَ، وَهٰذَا الۡبَلَدِ الۡاَمِيۡنِ، لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِيۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِيۡمٍ، ثُمَّ رَدَدۡنٰهُ اَسۡفَلَ سٰفِلِيۡنَ، اِلَّا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ، فَلَهُمۡ اَجۡرٌ غَيۡرُ مَمۡنُوۡنٍ. فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعۡدُ بِالدِّيۡنِ؟ اَلَيۡسَ اللّٰهُ بِاَحۡكَمِ الۡحٰكِمِيۡنَ؟ (التین ۹۵: ۱۔۸)

”تین اور زیتون گواہی دیتے ہیں، اور طور سینین اور (تمھارا) یہ شہر امین بھی کہ انسان کو ہم نے (ان مقامات پر) پیدا کیا تو اس وقت وہ بہترین ساخت پر تھا۔ پھر ہم نے اسے پستی میں ڈال دیا، اس طرح کہ وہ خود ہی پستیوں میں گرنے والا ہوا۔ رہے وہ جو ایمان پر قائم رہے اور انھوں نے نیک عمل کیے تو اُن کے لیے ایسا اجر ہے جو کبھی ختم نہ ہوگا۔ اس کے بعد کیا چیز ہے، (اے پیغمبر)، جو روز جزا کے بارے میں تمھیں جھٹلاتی ہے؟ (ان سے پوچھو)، کیا اللہ سب فیصلہ کرنے والوں سے بہتر فیصلہ کرنے والا نہیں ہے؟“

[باقی]

---

۸ آل عمران ۳: ۵۵۔

۹ الاعراف ۷: ۱۶۷۔

۱۰ ۱۹: ۲۹۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

منظور الحسن

''اسلام اور موسیقی''

''الاعتصام'' کی تنقید پر تبصرہ

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

۱

''اسلام اور موسیقی'' کے زیرعنوان مارچ ۲۰۰۴ کے ''اشراق'' میں ہم نے ایک مفصل مضمون تحریر کیا تھا۔ یہ مضمون استاذ گرامی جناب جاوید احمد صاحب غامدی کے افادات پر مبنی تھا اور اس میں یہ نقطۂ نظر پیش کیا گیا تھا کہ غنا یا موسیقی مباحات فطرت میں سے ہے۔ اسلامی شریعت اسے ہرگز حرام قرار نہیں دیتی۔ لوگ چاہیں تو حمد، نعت، غزل، گیت، یا دیگر المیہ، طربیہ اور رزمیہ اصناف شاعری میں فن موسیقی کو استعمال کر سکتے ہیں۔ شعر و ادب کی ان اصناف میں اگر شرک و الحاد اور فسق و فجور جیسے نفس انسانی کو آلودہ کرنے والے مضامین پائے جاتے ہوں تو یہ، بہر حال مذموم اور شنیع ہیں۔ اس شناعت کا باعث ظاہر ہے کہ نفس مضمون ہے۔ نفس مضمون اگر دین و اخلاق کی رو سے جائز ہے تو نظم، نثر، تقریر، تحریر، صدا کاری یا موسیقی کی صورت میں اس کے تمام ذرائع ابلاغ مباح ہیں، لیکن اس کے اندر اگر کوئی اخلاقی قباحت موجود ہے تو اس کی حامل مخصوص چیزوں کو لازماً لغو قرار دیا جائے گا۔ چنانچہ مثال کے طور پر اگر کسی نعت میں مشرکانہ مضامین کے اشعار ہیں تو اس نعت کی شاعری ناجائز سمجھی جائے گی، صنف نعت ہی کو غلط نہیں کہا جائے گا۔ اسی طرح اگر کوئی نغمہ فحش شاعری پر مشتمل ہو تو اس کے اشعار ہی لائق مذمت ٹھیریں گے، نہ کہ اصناف شعر و نغمہ کو مذموم تصور کیا جائے گا۔ تاہم، کسی موقع پر اگر کوئی اخلاقی برائی کسی مباح چیز کے ساتھ لازم و ملزوم کی حیثیت اختیار کر لے تو سد ذریعہ کے اصول کے تحت اسے وقتی طور پر ممنوع قرار دیا جا سکتا ہے۔

یہ نقطۂ نظر ہم نے اپنے فہم کے مطابق دینی نصوص کی روشنی میں اختیار کیا تھا۔ چنانچہ اس پر استدلال کے لیے ہم

نے قرآن مجید کے حوالے سے یہ بیان کیا تھا کہ موسیقی کے بارے میں یہ کتاب اصلاً خاموش ہے۔ اس کے اندر کوئی ایسی آیت نہیں ہے جو موسیقی کی حلت و حرمت کے بارے میں کسی حکم کو بیان کر رہی ہو۔ البتہ، اس میں بعض ایسے اشارات ضرور موجود ہیں جن سے موسیقی کے جواز کی تائید ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر اس کی آیات میں قوافی کے التزام کی بنا پر یہ بات بجا طور پر کہی جا سکتی ہے کہ اس میں صوتی آہنگ کی رعایت کی گئی ہے۔ مزید براں اس میں یہ بیان ہوا ہے کہ سیدنا داؤد علیہ السلام جب اللہ کی حمد و ثنا کرتے تو اللہ کے اذن سے پہاڑ اور پرندے ان کے ہم نوا ہو جاتے تھے، جبکہ قدیم صحائف سے یہ بات واضح طور پر معلوم ہوتی ہے کہ سیدنا داؤد علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا ساز و سرود کے ساتھ کرتے تھے۔ یہ اور اس نوعیت کے بعض دوسرے اشارات کی بنا پر قرآن سے موسیقی کے جواز کا یقینی حکم اخذ کرنا تو بلاشبہ، کلام کے اصل مدعا سے تجاوز ہوگا، لیکن بالبداہت واضح ہے کہ ان کی موجودگی میں اس کے عدم جواز کا حکم بھی کسی صورت میں اخذ نہیں کیا جا سکتا۔

بائیبل کے حوالے سے ہم نے لکھا تھا کہ اس میں موسیقی اور آلات موسیقی کا ذکر متعدد مقامات پر موجود ہے۔ ان سے بصراحت یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ پیغمبروں کے دین میں موسیقی یا آلات موسیقی کو کبھی ممنوع قرار نہیں دیا گیا۔ بیش تر مقامات پر اللہ کی حمد و ثنا کے لیے موسیقی کے استعمال کا ذکر آیا ہے۔ چنانچہ یہ بیان ہوا ہے کہ سیدنا داؤد علیہ السلام نہایت خوش الحان تھے اور گیتوں کی صورت میں اللہ کی حمد و ثنا کرتے تھے۔ آپ پر نازل ہونے والی کتاب ''زبور'' ان الہامی گیتوں کا مجموعہ ہے جو آپ نے بربط پر گائے تھے۔ اس کے علاوہ خوشی، غمی اور جنگی مواقع کے حوالے سے بھی موسیقی کا ذکر مثبت انداز سے آیا ہے۔ اس کتاب مقدس میں بعض مقامات پر موسیقی کا ذکر شراب نوشی اور فحاشی کے مظاہر کے ساتھ آیا ہے۔ ان سے بادی النظر میں اس کی شناعت کا مفہوم اخذ کیا جا سکتا ہے، مگر سیاق و سباق اور اسلوب بیان سے واضح ہے کہ ان جگہوں پر موسیقی کی نہیں، بلکہ رذائل اخلاق کی شناعت بیان ہوئی ہے۔ ان کی بنا پر یہ بات بجا طور پر کہی جا سکتی ہے کہ موسیقی کی جو صورتیں اخلاقی قباحتوں کے ساتھ ملحق ہوں، وہ شنیع قرار دی جا سکتی ہیں۔

احادیث نبوی کے ضمن میں ہماری رائے یہ تھی کہ ان کے مجموعوں میں صحیح اور حسن کے درجے کی متعدد روایات موسیقی اور آلات موسیقی کے جواز پر دلالت کرتی ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ عید کے ایک موقع پر ام المومنین سیدہ عائشہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں گانا سنا؛ شادی کی ایک تقریب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو گانے کی ترغیب دی اور مثبت طور پر اس بات کا اظہار فرمایا کہ انصار گانے کو پسند کرتے ہیں؛ ہجرت کے بعد آپ مدینہ تشریف لائے تو عورتوں اور بچوں نے دف بجا کر استقبالیہ گیت گائے اور آپ نے انھیں پسند فرمایا؛ ایک مغنیہ نے آپ کی

www.javedahmadghamidi.net www.ghamidi.com

خدمت میں حاضر ہو کر اپنا گانا سنانے کی خواہش ظاہر کی تو آپ نے سیدہ عائشہ کو اس کا گانا سنوایا؛ سفروں میں آپ نے صحرائی نغموں کی معروف قسم حدی خوانی کو نہ صرف پسند فرمایا، بلکہ اپنے اونٹوں کے لیے ایک خوش آواز حدی خوان بھی مقرر کیا اور اعلان نکاح کے لیے آپ نے آلۂ موسیقی دف بجانے کی تاکید فرمائی۔ موسیقی کے جواز کی روایتوں کے علاوہ اس کی ممانعت کی روایتیں بھی حدیث کی کتابوں میں مذکور ہیں، مگر ان میں سے بیش تر کو محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے۔ تاہم، ان کے مضامین سے معلوم ہوتا ہے کہ ممانعت کا سبب ان کی بعض صورتوں کا شراب نوشی، فواحش اور بعض دوسرے رذائل اخلاق سے وابستہ ہونا ہے۔

قرآن، بائیبل اور احادیث کی روشنی میں اس بات کو پیش کرنے کے بعد کہ اسلام نے موسیقی کی علی الاطلاق حرمت کا حکم ہرگز صادر نہیں کیا ہے، ہم نے ''موسیقی کی شناعت کے بعض پہلو'' کے زیر عنوان اس بات کی تصریح کی تھی کہ اسلام کی رو سے موسیقی کی وہ اصناف لازماً شنیع قرار پائیں گی جن سے منکرات وفواحش وابستہ ہو جائیں یا جو انسان کے اندر ہیجان پیدا کرنے اور سفلی اور شہوانی جذبات کو انگیخت کرنے کا باعث بنیں۔ اس کا سبب ہم نے یہ بیان کیا تھا کہ دین کا مقصد چونکہ تزکیۂ نفس ہے اور وہ انسانوں سے یہ چاہتا ہے کہ وہ اپنے نفس کو فکر و عمل کی مختلف آلایشوں سے پاک کر کے جنت کے مستحق بن جائیں، لہٰذا وہ انھیں ان اعمال کی ترغیب دیتا ہے جو نفس انسانی کے لیے پاکیزگی حاصل کرنے کا ذریعہ بنیں اور ان سے روکتا ہے جو اسے آلودہ کرنے کا باعث ہوں۔

ہمارا مضمون اسی نقطۂ نظر کی تفصیل اور اسی استدلال کی توضیح پر مبنی تھا۔ اس مضمون پر مسلک اہل حدیث کے ترجمان ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور نے ۱۱ اقساط پر مشتمل ایک مفصل تنقیدی مقالہ شائع کیا ہے جس میں ہمارے نقطۂ نظر اور اس کی بنائے استدلال کو صریح طور پر غلط قرار دیا گیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ کسی مضمون پر تنقید اصلاً ایک مثبت عمل ہوتا ہے۔ اس کے نتیجے میں علم و دانش کے نئے دریچے کھلتے ہیں۔ اگر کوئی بات مصنف کے سہو یا سوے فہم کے نتیجے میں غلط طور پر بیان ہوگئی ہو تو اس کا امکان ہوتا ہے کہ وہ تنقید کی روشنی میں اپنی تالیف پر نظر ثانی کرے گا۔ چنانچہ یہ بات بالکل بجا ہے کہ تنقید وہ زینہ ہے جس پر علم اپنے ارتقا کی منزلیں طے کرتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ علمی ارتقا کی خدمت کا فریضہ صرف اور صرف وہی تنقید انجام دیتی ہے جس میں مصنف کا نقطۂ نظر تعصب سے بالاتر ہو کر پوری دیانت داری سے سمجھا گیا ہو اور بے کم وکاست بیان کیا گیا ہو، جس میں مصنف کے محرکات طے کر کے انھیں ہدف تنقید بنانے کے بجائے اس کے استدلال کے نکات کو متعین کر کے ان پر تنقید کی گئی ہو، جس میں ضمنیات کو نمایاں کر کے ان پر مباحث لکھنے کے بجائے اساسات کو بنیاد بنا کر ان پر بحث کی گئی ہو اور جس میں الزام تراشی،

دروغ گوئی اور دشنام طرازی کے بجائے سنجیدہ اور شایستہ اسلوب بیان میں اپنی بات سمجھائی گئی ہو۔ اگر کوئی تنقید ان معیارات پر پوری نہیں اترتی تو صاف واضح ہے کہ وہ علم کی ترقی میں کوئی کردار ادا نہیں کر سکتی۔ علم کی دنیا میں اس کی حیثیت محض رطب و یابس کی ہوتی ہے اور اصحاب علم و دانش اس سے اعتنا برتنے کو بھی غیر علمی رویے پر محمول کرتے ہیں۔

ہمارے لیے یہ بات باعث تاسف ہے کہ ''الاعتصام'' کی مذکورہ تنقید ان معیارات پر پوری اترتی ہوئی محسوس نہیں ہوتی۔ چنانچہ یہ عین ممکن ہے کہ اہل دانش ہمارے اسے درخور اعتنا سمجھنے کو دانش مندی کے منافی قرار دیں، مگر ہمیں یقین ہے کہ وہ دو گزارشات سننے کے بعد ہمارے اس طرز عمل کی تائید کریں گے: اولاً، مذکورہ تنقید میں جو کچھ بھی بیان کیا گیا ہے، اس میں چونکہ بظاہر علمی استدلال کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے، اس لیے اس کا اندیشہ ہے کہ بعض قارئین اس کی بنا پر کسی قسم کے انتشار فہم میں مبتلا ہو جائیں، لہٰذا ضروری توضیحات ناگزیر ہیں۔ ثانیاً، خدمت دین کی ایک ہی برادری سے تعلق رکھنے کی بنا پر یہ ہماری برادرانہ ذمہ داری ہے کہ معاصر جریدے کی تلخ نوائی سے صرف نظر کرتے ہوئے، اس کی مخاطبت کا جواب دیں۔ چنانچہ مضمون کی ترتیب سے ''الاعتصام'' کی تنقیدات پر ہمارا تبصرہ پیش خدمت ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

ہمارے مضمون کے پہلے باب کا عنوان ''قرآن اور موسیقی''، دوسرے کا ''بائبل اور موسیقی'' اور تیسرے کا ''احادیث اور موسیقی'' تھا۔ ''الاعتصام'' نے پہلے دو ابواب پر کوئی تبصرہ کیے بغیر تیسرے باب سے اپنی تنقید کا آغاز کیا ہے۔ ابتدائی دو ابواب کے مباحث پر ان کی خاموشی کو ہم ـــــ خاموشی نیم رضا کے مقولے پر محمول کر کے آگے بڑھتے ہیں اور ''احادیث اور موسیقی'' کے باب پر ان کی تنقیدات کا ملاحظہ کرتے ہیں۔

عید پر موسیقی

''عید پر موسیقی'' کے زیر عنوان ہم نے بخاری کی روایت رقم ۹۰۷ سے موسیقی کے جواز پر استدلال کیا تھا۔ اس روایت میں سیدہ عائشہ نے بیان کیا ہے کہ عید کے دن ان کے گھر پر 'جاریتان' (دو لونڈیاں/لڑکیاں) جنگ بعاث کے گیت گا رہی تھیں۔ اسی اثنا میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور اپنا رخ دوسری جانب کر کے بستر پر دراز ہو گئے۔ پھر سیدنا ابوبکر صدیق آئے اور سیدہ کو سرزنش کرتے ہوئے کہا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ شیطانی ساز کیوں بجائے جا رہے ہیں؟ نبی کریم یہ سن کر متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ انھیں کرنے دو۔ پھر جب حضرت ابوبکر دوسرے کام میں مشغول ہوئے تو سیدہ نے 'جاریتان' کو جانے کا اشارہ کیا اور وہ چلی گئیں۔

اس روایت سے استدلال کرتے ہوئے ہم نے بیان کیا تھا کہ اس سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم عید کے موقع پر موسیقی کو ناجائز نہیں سمجھتے تھے۔ ام المومنین سیدہ عائشہ کا آپ کی موجودگی میں گانا سننا، آپ کا اس پر نہ پابندی عائد کرنا اور نہ کسی ناراضی کا اظہار فرمانا، بلکہ سیدنا ابوبکر کو بھی مداخلت سے روک دینا، یہ سب باتیں موسیقی کے مباح ہونے ہی کو بیان کر رہی ہیں۔

لفظ 'جاریتان' کے مفہوم کے حوالے سے حاشیے میں ہم نے یہ تصریح کی تھی کہ اس سے بعض لوگوں نے ''بچیاں'' مراد لیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ 'جاریۃ' کا اطلاق ''بچی'' پر بھی کیا جا سکتا ہے، مگر یہاں لازم ہے کہ اس سے ''لونڈیاں'' ہی مراد لیا جائے اور لونڈیاں بھی وہ جو ماہر فن مغنیات کی حیثیت سے معروف تھیں۔ روایت کے اسلوب بیان کے علاوہ اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اسی روایت کے دوسرے طریق: بخاری، رقم ۳۷۱۶ میں 'جاریتان' کے بجائے 'قینتان' کے الفاظ نقل ہوئے ہیں اور 'قینۃ' کا معلوم و معروف معنی ''پیشہ ور مغنیہ'' ہے۔

www.javedahmadghamidi.net
www.ghamidi.com

ہمارے اس استدلال پر ''الاعتصام'' کی تنقید کا خلاصہ یہ ہے کہ بخاری ہی میں درج اس روایت کے ایک اور طریق: رقم ۹۵۲ میں گانے والیوں کے بارے میں سیدہ کے یہ الفاظ نقل ہوئے ہیں کہ 'لیستا بمغنیتین' یعنی وہ مغنیہ نہیں تھیں۔ چنانچہ انھیں مغنیہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ مزید براں 'جاریتان' کا معنی لونڈی کرنا اور اس سے 'قینتان' والے طریق کی روشنی میں مغنیات مراد لینا درست نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اولاً، 'جاریۃ' کے لفظ کا اطلاق عموماً بچی اور نابالغ لڑکی پر ہوتا ہے، اس لیے اس سے بچیاں ہی مراد لینا چاہیے۔ ثانیاً، مذکورہ روایت کے چار طرق میں سے تین میں 'جاریتان' کا لفظ آیا ہے، جبکہ صرف ایک طریق یعنی امام شعبہ کے طریق میں 'قینتان' کا لفظ آیا ہے، لہٰذا یہاں 'جاریۃ' کا اطلاق ہی زیادہ قرین قیاس ہے۔ ثالثاً، اگر 'قینتان' والے طریق کو من وعن قبول بھی کر لیا جائے تب بھی اس سے مغنیات مراد لینا درست نہیں ہے، کیونکہ 'قینۃ' کے معنی فقط پیشہ ور مغنیہ قرار دینا لغوی طور پر غلط ہے۔ جہاں تک ان کے غنا کا تعلق ہے تو اس سے وہ غنا مراد نہیں ہے جو اہل لہو ولعب کے نزدیک معروف ہے، بلکہ سادہ طریقے سے اشعار پڑھنا مراد ہے۔

درج بالا خلاصہ ''الاعتصام'' کے جن متون پر مبنی ہے، ان میں چونکہ الفاظ اور ان کے معانی کو زیر بحث لایا گیا ہے، لغات سے مراجعت کی گئی ہے، روایتوں کی اسناد پر جرح کی گئی ہے اور شارحین حدیث کے حوالے نقل کیے گئے ہیں، اس لیے بادی النظر میں یہ علمی بحث و تمحیص کا تاثر دیتے ہیں، مگر عجیب بات یہ ہے کہ ان میں ہمارے اصل استدلال کو زیر بحث ہی نہیں لایا گیا۔ چنانچہ اس سے پہلے کہ ان نکات پر اپنا نقطۂ نظر پیش کریں، ہم اہل الاعتصام سے یہ گزارش

کریں گے کہ وہ ایک مرتبہ پھر ہماری تحریر کا مطالعہ فرمالیں، ہمیں امید ہے کہ ان پر یہ بات پوری طرح واضح ہو جائے گی کہ اس حدیث کے حوالے سے ہماری بناے استدلال اصلاً نہ 'جاریتان' (دولڑکیاں/لونڈیاں) کے الفاظ ہیں اور نہ 'قینتان' (دوگانے والیاں/لونڈیاں) کے، بلکہ یہ واقعہ ہے کہ دولڑکیوں یا لونڈیوں نے گیت گایا، سیدہ نے اسے سنا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ گانے والیوں کو گانے سے روکا اور نہ سیدہ کو گانے کی سماعت سے منع فرمایا۔ یہی نقطۂ نظر ہے جسے ہم نے اس روایت کے حوالے سے بیان کیا ہے۔

چنانچہ بر سبیل تنزل ''الاعتصام'' کے مذکورہ نکات کو من وعن تسلیم بھی کر لیا جائے تب بھی ہماری بناے استدلال میں ادنیٰ تغیر واقع نہیں ہوتا۔ ہماری یہ بناے استدلال صرف اور صرف اسی صورت میں ختم ہوگی، جب اہل الاعتصام درج بالا حدیث کے حوالے سے حسب ذیل نکات کی تردید کریں گے:

۱۔ سیدہ عائشہ نے غنا سنا۔

۲۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس دوران میں تشریف لائے، مگر آپ نے سیدہ کو غنا سننے سے منع نہیں فرمایا۔

۳۔ سیدنا ابوبکر نے جب سیدہ کو غنا سننے سے روکنا چاہا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں روکنے سے منع فرما دیا۔

وہ اگر ان نکات کی تردید کرنا چاہتے ہیں تو تھوڑی دیر کے لیے توقف کر کے یہ ضرور سوچ لیں کہ اس تردید کو کوئی شخص انکار حدیث سے بھی تعبیر کر سکتا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ وہ اس حدیث کا پاس کریں یا نہ کریں، کم سے کم اس دعوے کا پاس ضرور کریں گے جو ''مسلک اہل حدیث کا داعی اور ترجمان'' کے الفاظ میں ''الاعتصام'' کے سرورق پر ہمیشہ سے رقم رہا ہے۔

اس وضاحت کے بعد آیئے اب ان کی تنقید کا جائزہ لیتے ہیں:

'لیستا بمغنیتین' کا جملہ

''الاعتصام'' نے لکھا ہے:

> ''بڑے وثوق سے فرمایا گیا ہے کہ گانے والیاں ''ماہر فن مغنیات'' اور ''پیشہ ور مغنیہ'' تھیں اور یہ اس لیے کہ ایک روایت میں ''جاریتان'' کی بجائے ''قینتان'' کا لفظ ہے۔
>
> بڑے ہی افسوس سے عرض ہے کہ غامدی صاحب کو بخاری کی ایک روایت میں... ''قینتان'' کا لفظ تو نظر آ گیا۔ مگر... بخاری ہی کی ایک روایت رقم ۹۵۲ میں خود حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی یہ وضاحت نظر نہ آئی کہ ''قالت ولیستا بمغنیتین'' انھوں نے فرمایا وہ دونوں مغنیہ نہ تھیں... حضرت عائشہ صدیقہ کی اس وضاحت کے بعد کہ وہ دونوں ''مغنیہ'' نہ تھیں، پھر بھی یہ ضد کرنا اور اس پر اڑنا کہ وہ ''پیشہ ور مغنیہ'' اور ''ماہر فن مغنیہ'' تھیں، علم کی کون سی معراج ہے؟ یہ ضد کسی

ضدی، نافہم بچے کی تو ہو سکتی ہے، کسی صاحب علم اور بالغ نظر محقق سے اس کی توقع نہیں کی جا سکتی۔'' (۷/۷/۵:۲۰)

یہ ''الاعتصام'' کی تنقید کا پہلا نکتہ ہے اور اسی پر ان کی تمام تر تنقید کا انحصار ہے۔'قالت و لیستا بمغنیتین' (انھوں نے کہا کہ وہ مغنیات نہیں تھیں) کے جملے کے بارے میں ہمارا نقطۂ نظر یہ ہے کہ یہ درحقیت سیدہ عائشہ کا قول ہی نہیں ہے۔ یہ بعد کے راویوں کا اپنا قیاس ہے جسے انھوں نے روایت کے متن میں شامل کر دیا ہے۔ اس ضمن میں مدیر ''الشریعہ'' اور ''المورد'' میں ہمارے رفیق عمار خان صاحب ناصر کی تحقیق حسب ذیل ہے:

''روایت کے تمام طرق جمع کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا اس واقعے کی اصل اور مرکزی راوی ہیں۔ ان سے یہ واقعہ ان کے بھانجے عروہ بن زبیر نے نقل کیا ہے اور عروہ سے ان کے یہ چار شاگرد اس کو روایت کرتے ہیں:

۱۔ ابوالاسود بمطابق بخاری، رقم ۲۶۹۱۔

۲۔ ابن شہاب زہری بمطابق بخاری، رقم ۹۳۴۔

۳۔ محمد بن عبدالرحمٰن الاسدی بمطابق بخاری، رقم ۸۹۷۔

۴۔ ہشام بن عروہ بمطابق بخاری، رقم ۸۹۹۔

ان میں سے پہلے تین شاگردوں یعنی ابوالاسود، ابن شہاب زہری اور محمد بن عبدالرحمٰن الاسدی کے طرق میں 'قالت و لیستا بمغنیتین' کا جملہ موجود نہیں ہے۔ یہ صرف ہشام بن عروہ ہیں جن کے طریق میں یہ جملہ نقل ہوا ہے۔ اصول روایت کی رو سے یہ بات بعید از قیاس ہے کہ ایک استاد کے چار شاگردوں میں سے تین شاگرد ایک جملہ نقل کرنا بھول گئے ہوں اور صرف ایک کو یاد رہا ہو۔

ہشام بن عروہ کے اس واحد طریق کی جس میں مذکورہ جملہ نقل ہوا ہے، تفصیلات جمع کرنے سے مزید یہ بات واضح ہوتی ہے کہ خود ہشام بن عروہ کی طرف بھی اس جملے کی روایت کو منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ دیکھیے، اس واقعے کو ہشام سے ان کے ان پانچ شاگردوں نے نقل کیا ہے:

۱۔ شعبہ بمطابق بخاری، رقم ۳۶۳۸۔

۲۔ حماد بن سلمہ بمطابق مسند احمد، رقم ۲۳۸۷۹۔

۳۔ عبداللہ بن نمیر بمطابق المعجم الکبیر، رقم ۲۸۸۔

۴۔ ابومعاویہ بمطابق مسند اسحاق بن راہویہ ۲/۲۷، رقم ۷۸۰۔

۵۔ ابواسامہ بمطابق بخاری، رقم ۸۹۹۔

ان پانچ میں سے پہلے چار شاگردوں کے طرق میں اس جملے کا کوئی وجود نہیں ہے۔ صرف آخری شاگرد ابواسامہ

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

کی روایت میں اس جملے کا اضافہ ہوا ہے۔ چنانچہ یہ قرار دینا خلاف قیاس ہوگا کہ ہشام کے چار شاگرد یہ جملہ بیان کرنا بھول گئے اور صرف ابواسامہ نے اس کو یاد رکھا۔

اس تفصیل سے واضح ہے کہ یہ جملہ اصل روایت کا حصہ نہیں ہے اور نہ اسے ام المومنین کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے۔''

'جاریتان' کا معنی اور مصداق

''الاعتصام'' نے لکھا ہے:

''حدیث میں ''جاریتان'' کا لفظ استعمال ہوا ہے اور ''جارية'' کا عموماً اطلاق بچی اور نابالغ لڑکی پر ہوتا ہے، اور اس کا اعتراف گوغامدی صاحب کو بھی ہے کہ ''جارية'' کا لفظ بچی کے معنی میں بھی آتا ہے۔ اس اعتبار سے اس حدیث سے بالغ عورتوں کے لیے گانے بجانے کا جواز ڈھونڈنا اندھے کو اندھیرے میں بڑی دور کی سوجھی کا مصداق ہے۔... یہی وجہ ہے کہ شارحین حدیث نے انھیں نابالغ ہی قرار دیا ہے۔ چنانچہ علامہ عینی رقم طراز ہیں: الجارية فی النساء کالغلام فی الرجال ویقال علی من دون البلوغ۔ (عمدة القاری ۲۶۸/۶): ''جاریہ کا اطلاق عورتوں میں اسی طرح ہے جس طرح غلام کا اطلاق مردوں میں ہے اور جاریہ اسے کہتے ہیں جو ابھی بالغ نہ ہو۔'' (۱۷:۵۷/۸)

یہ بات درست نہیں ہے کہ ''جاریہ کا عموماً اطلاق بچی اور نابالغ لڑکی پر ہوتا ہے۔'' تمام اہل لغت بلا استثنا یہ کہتے ہیں کہ جاریہ کا لفظ لڑکی کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور لونڈی کے لیے بھی۔ پہلے معنی میں اس کا اطلاق کم سن بچی سے لے کر نوجوان دوشیزہ تک، ہر عمر کی لڑکی پر ہو سکتا ہے اور دوسرے معنی میں یہ ہر عمر کی لونڈی کے لیے مستعمل ہے۔

صاحب ''لسان العرب'' لکھتے ہیں:

الجارية: الفتية من النساء. (۱۴۳/۱۴) ''جاریہ جوان عورت کو کہتے ہیں۔''

''تاج العروس'' میں ہے:

الجارية فتية النساء. (۷۲/۱۰) ''جاریہ جوان عورت کو کہتے ہیں۔''

''المعجم الوسیط'' میں درج ہے:

الجارية: الامة وان کانت عجوزا. والفتية من النساء. (۱۱۹/۱) ''جاریہ کے معنی لونڈی کے ہیں خواہ وہ بوڑھی ہو۔ اور جوان عورت کو بھی کہتے ہیں۔''

''الرائد'' میں بیان ہوا ہے:

الجارية: ج: جوار. الفتاة. الامة. ''جاریہ کی جمع جوار ہے اس کے معنی جوان عورت،

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

العبدة . الخادمة. (۱/۴۹۴) لونڈی اور خادمہ کے ہیں۔''

درج بالا لغات کی بنا پر یہ دعویٰ صریح طور پر غلط ثابت ہوگیا ہے کہ ''جاریہ کا عموماً اطلاق بچی اور نابالغ لڑکی پر ہوتا ہے۔'' اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی واضح ہوگئی ہے کہ یہ لفظ لونڈی اور لڑکی کے دو مختلف معنوں کا حامل ہے۔ اب ظاہر ہے کہ یہ لفظ جب کسی کلام میں استعمال ہوگا تو اس کا فیصلہ کہ یہاں اس سے مراد لونڈی ہے یا لڑکی، مجرد طور پر نہیں، بلکہ سیاق کلام اور دیگر قرائن کی بنا پر کیا جائے گا۔ ہمارے نزدیک روایت کے حسب ذیل داخلی اور خارجی شواہد کی بنا پر یہ زیادہ قرین قیاس ہے کہ یہاں اس سے لونڈی مراد لیا جائے:

۱۔'جاریتان' کے ساتھ 'تغنیان' کا فعل آیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ دونوں گا رہی تھیں۔ یہ بات معلوم و معروف ہے کہ اس زمانے میں عرب میں گانے یا غنا کا پیشہ بالعموم لونڈیوں ہی سے وابستہ تھا۔ وہ تہواروں کے موقع پر اور خوشی کی تقریبات میں اس کا مظاہرہ کرتی رہتی تھیں۔ آزاد عورتیں اور لڑکیاں نہ اس فن کو سیکھتی تھیں اور نہ اس کا مظاہرہ کرتی تھیں۔

۲۔ روایت میں مذکور سیدنا ابوبکر کے تبصرے 'مزمار الشیطان عند النبی' سے بھی یہی تاثر ہوتا ہے کہ گانے والیاں بچیاں نہیں تھیں۔ ظاہر ہے کہ اگر وہ چھوٹی بچیاں ہوتیں تو محض ان کے کھیل پر سیدنا ابوبکر ''شیطانی ساز'' کے الفاظ میں سرزنش نہ کرتے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی عید کے موقعے کا حوالہ دیے بغیر سیدنا ابوبکر کو مداخلت سے روکتے۔

۳۔ اسی روایت کے ایک اور طریق (بخاری، رقم ۳۷۱۶) میں 'جاریتان' کے بجائے 'قینتان' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ 'قینة' کے معنی مغنیہ یا گانے والی لونڈی کے ہیں۔

۴۔ شارح بخاری علامہ ابن حجر عسقلانی نے بعض روایتوں کی بنا پر ان لونڈیوں کا تعین بھی کیا ہے۔ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے ایک لونڈی حضرت حسان بن ثابت کی مملوکہ تھی۔ ایک روایت میں بیان ہوا ہے کہ یہ دونوں حضرت عبداللہ بن سلام کی لونڈیاں تھیں۔ ایک گانے والی کا نام حمامہ بیان ہوا ہے اور دوسری کے بارے میں یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ وہ زینب تھی اور اسے شادی بیاہ کی تقریبات میں گانا گانے کے لیے مدعو کیا جاتا تھا۔ ایک روایت کے مطابق خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدہ عائشہ سے فرمایا تھا کہ وہ گانے کے لیے زینب کو دلہن کے ساتھ بھیج دیں۔ فتح الباری میں ہے:

وللطبرانی من حدیث ام سلمة ان احداھما کانت لحسان بن ثابت ''طبرانی میں ام سلمہ کی روایت میں ہے کہ ان میں سے ایک حسان بن ثابت کی لونڈی تھی۔ سلمیٰ کی

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

وفی الاربعین للسلمی انهما کانتا لعبد اللّٰه بن السلام، وفی العیدین لابن ابی الدنیا من طریق فلیح عن هشام بن عروة 'وحمامة وصاحبتها تغنیان' واسناده صحیح ، لم اقف علی تسمیة الاخری. لکن یحتمل ان یکون اسم الثانیة زینب وذکره فی کتاب النکاح. (۴۴۰/۴)

'اربعین' میں ہے کہ یہ دونوں حضرت عبداللہ بن سلام کی لونڈیاں تھیں۔ ابن ابی الدنیا کی ''العیدین'' میں ہے ہشام بن عروہ سے فلیح کی سند کے ساتھ بیان ہوا: 'حمامہ اور اس کی ساتھی گا رہی تھیں'۔ اس کی سند صحیح ہے۔ دوسری لونڈی کے نام سے میں واقف نہیں ہوں مگر احتمال یہی ہے کہ اس کا نام زینب ہے۔ اور اس کا ذکر کتاب النکاح میں آیا ہے۔''

وفی حدیث جابر عند المحاملی 'ادرکیها یا زینب' امراة کانت تغنی بالمدینة ویستفاد منه تسمیة المغنیة الثانیة فی القصة التی وقعت فی حدیث عائشة الماضی فی العیدین حیث جاء فیه 'دخل علیها وعندها جاریتان تغنیان' وکنت ذکرت هناك ان اسم احداهما حمامة کما ذکره ابن ابی الدنیا فی کتاب العیدین له باسناد حسن. (۲۲۶/۹)

''محاملی کی ایک روایت جو حضرت جابر سے ہے، اس میں 'زینب اس (دلہن) کے پاس جاؤ' کے الفاظ ہیں۔ یہ (زینب) مدینے میں گاتی تھی۔ اس روایت سے اس دوسری مغنیہ لونڈی کا نام جاننے میں مدد ملتی ہے جس کا ذکر حضرت عائشہ کی اس روایت میں آیا ہے جو کتاب العیدین میں گزر چکی ہے اور جس کے الفاظ یہ ہیں کہ 'نبی صلی اللہ علیہ وسلم ام المومنین کے پاس آئے، جبکہ ان کے پاس دو لونڈیاں گا رہی تھیں'۔ ایک کا نام تو ہم نے اس روایت کی شرح ہی میں حمامہ لکھا تھا، جیسا کہ ابن ابی الدنیا نے اپنی کتاب العیدین میں حسن سند کے ساتھ بیان کیا ہے۔''

امام ابن حجر نے ''الاصابہ فی تمییز الصحابہ'' میں بھی زینب کا ذکر اسی پہلو سے کیا ہے:

(زینب) الانصاریة ...غیر منسوبة جاء انها کانت تغنی بالمدینة فاخرج ابن طاهر فی کتاب الصفوة من طریق المحاملی ... ان جمیلة اخبرته انها سالت جابر بن عبد اللّٰه عن الغناء

''(زینب) انصاری خاتون تھی... اس کی نسبت کسی کی طرف نہیں۔ یہ مدینہ میں گاتی تھی۔ ابن طاہر کتاب الصفوہ میں محاملی کی یہ روایت لائے ہیں کہ... جمیلہ نے انھیں بتایا کہ انھوں نے جابر بن عبداللہ سے غنا کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے بیان کیا کہ

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

فقال نكح بعض الانصار بعض اهل عائشة فاهدتها الى قباء فقال لها رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه و آله و سلم اهديت عروسك قالت نعم قال فارسلت معها بغناء فان الانصار يحبونه قالت لا قال فادركيها بزينب امراة كانت تغنى بالمدينة. (۱۴/۱۴۳)

انصار کے ایک مرد نے سیدہ عائشہ کی ایک رشتہ دار خاتون سے نکاح کیا۔ سیدہ نے اسے قبا کی طرف بھیج دیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدہ سے پوچھا کہ کیا تم نے ان کی طرف دلہن کو رخصت کر دیا ہے؟ سیدہ نے اثبات میں جواب دیا۔ آپ نے فرمایا کہ کیا اس کے ساتھ غنا کا اہتمام بھی کیا ہے؟ کیونکہ انصار گانا پسند کرتے ہیں۔ سیدہ نے فرمایا نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ زینب کو اس کے ساتھ بھیجو۔ زینب مدینے میں گاتی تھی۔''

'قینتان' کے معنی

''الاعتصام'' نے لکھا ہے:

'''''قینہ'' کے معنی ''پیشہ ور مغنیہ'' ہی قرار دینا بجائے خود غلط ہے۔... علامہ زمخشری حضرت عائشہ کی یہی حدیث ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''القینہ لونڈی کو کہتے ہیں، وہ گانا گائے یا نہ گائے۔'' (الفائق: ۲/۱۹۰) اسی طرح علامہ جوہری رقم طراز ہیں: ''القینہ کے معنی لونڈی ہے، وہ گانے والی ہو خواہ نہ گانے والی ہو... ''ابوعمرو نے کہا ہے کہ اہل عرب ہر غلام کو ''قین'' اور لونڈی کو ''قینۃ'' کہتے ہیں اور بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ''القینۃ'' خاص طور پر مغنیہ کو کہتے ہیں، حالاں کہ ایسا نہیں ہے۔'' (الصحاح ۶/۲۱۸۶) غور فرمائیے ابوعمرو جس معنی کی تردید کر رہے ہیں، ہمارے یہ متجددین اسی معنی کی بنیاد پر ''القینۃ'' کے معنی ''پیشہ ور مغنیہ'' قرار دینے پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔ دیتے ہیں دھوکہ یہ بازی گر کھلا... علامہ ابن منظور نے بھی لسان العرب میں ابوعمرو کا مذکورہ قول ذکر کیا اور اس کے متصل بعد حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی مذکورۃ الصدر روایت نقل کر کے وضاحت فرما دی کہ ''القینۃ'' سے مراد لونڈی ہے وہ گانا گائے یا نہ گائے''۔'' (۷/۵۷:۲۱)

مزید لکھتے ہیں:

''یہ روایت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے عروہ نے بیان کی ہے اور ان سے روایت کرنے والوں میں محمد بن عبدالرحمٰن ابوالاسود الاسدی، ہشام، ابن شہاب زہری تینوں کی روایت میں جاریتان کا لفظ ہے رقم ۹۴۹، ۹۵۳، ۳۵۲۵۔ البتہ ہشام سے شعبہ کی روایت میں ''قینتان'' کا لفظ ہے، رقم ۳۹۳۱۔ اور اسی روایت میں یہ شک بھی بیان ہوا ہے کہ یہ عیدالفطر کا دن تھا یا عیدالاضحیٰ کا۔... گویا صرف امام شعبہ کی روایت میں ''قینتان'' کا ذکر ہے اور اسی میں شک کا ایک اور پہلو بھی موجود ہے۔ باقی روایات میں ''جاریتان'' ہی کا لفظ ہے۔ بلکہ مسند امام احمد (ج ۶

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

ص:۹۹) میں خودشعبہ کی روایت میں بھی ’’جـاریتان ‘‘ہی کا لفظ ہے۔ یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ امام شعبہ نے بھی اگر ’’قینتان ‘‘ کا لفظ ایک روایت میں بیان کیا ہے تو اس کے معنی بھی ’’جاریتان ‘‘ہی ہے۔ جیسا کہ اہل عرب کے ہاں معروف ہے۔ کہ ’’قیـنة ‘‘ کے معنی جاریہ ہے۔ بایں طور بھی امام شعبہ کی ایک روایت کے مطابق ’’قیـنة ‘‘ کے معنی پیشہ ور مغنیہ قرار دینا محض خواہش پرستی ہے، علم کی کوئی خدمت نہیں۔‘‘(۷/۵۷:۲۱)

فرماتے ہیں کہ قینہ کے معنی لونڈی کے ہیں اور بخاری میں درج شعبہ کی روایت کے لفظ ’قیـنتان ‘ سے مراد احمد بن حنبل میں درج شعبہ ہی کی روایت کا لفظ ’جـاریتان ‘ ہے اور اس کے معنی دو لونڈیاں ہے۔ گویا بالفاظ دیگر یہ فرمایا گیا ہے کہ قینہ کا معنی لونڈی ہے اور روایات میں قینہ اور جاریہ باہم مترادف استعمال ہوئے ہیں، چنانچہ جاریہ کا معنی مغنیہ نہیں، بلکہ لونڈی کرنا ہوگا۔ اس تحقیق پر سوال صرف یہ ہے کہ اب اس پر زور استدلال کی کیا حیثیت ہے جو قبل ازیں ’جاریتان ‘ کا معنی چھوٹی بچیاں قرار دینے کے لیے کیا گیا تھا؟

چلیے، اس سے قطع نظر کرتے ہیں اور ’’الاعتصام‘‘ کے درج بالا بیانات کا جائزہ لیتے ہیں۔ ان کا خلاصہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ تین باتیں ارشاد فرمائی ہیں:

پہلی بات یہ فرمائی ہے کہ ’قیـنة ‘ کے معلوم ومعروف معنی مغنیہ کرنا درست نہیں ہے، کیونکہ اسے مجرد طور پر لونڈی کے معنی میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ لہٰذا مذکورہ روایت میں لفظ ’قیـنتان ‘ سے مغنیات نہیں، بلکہ غیر مغنیہ لونڈیاں مراد لینا چاہیے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

اس ضمن میں نمائندہ لغات کے چند حوالے ملاحظہ فرمائیے۔ ان سے واضح ہوگا کہ اگرچہ ’قیـنة ‘ کا لفظ مجرد طور پر لونڈی کے معنوں میں بھی استعمال ہو سکتا ہے، مگر اس کا کثیر استعمال مغنیہ لونڈی ہی ہے۔ واضح رہے کہ ان میں سے بیش تر لغات وہی ہیں جن کے حوالے ’’الاعتصام‘‘ نے کمال مہارت سے نقل کیے ہیں۔

’’لسان العرب‘‘ میں ہے:

القينة، الامة غنت او لم تغن كثيرا ما يطلق على المغنية فى الاماء . وفى الحديث: نهى عن بيع القينات اى الاماء المغنيات.(۱۳/۳۵۲)	’’قینہ لونڈی کو کہتے ہیں خواہ وہ مغنیہ ہو یا غیر مغنیہ۔ اس (قینہ) کا زیادہ تر اطلاق مغنیہ لونڈی پر ہوتا ہے۔ اور حدیث میں ہے: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قینات کی خرید وفروخت سے منع فرمایا ہے یعنی مغنیہ لونڈیوں کی خرید وفروخت سے۔‘‘

یہی بات ابن اثیر نے ’’النہایہ‘‘ میں بیان کی ہے:

القينة: الامة غنت او لم تغن، و كثيرا ما تطلق على المغنية من الاماء، وجمعها قينات. و منه الحديث 'نهى عن بيع القينات' اى الاماء المغنيات. (۱۳۵/۴)

''قینہ لونڈی کو کہتے ہیں خواہ وہ مغنیہ ہو یا غیر مغنیہ۔ اس کا زیادہ تر اطلاق مغنیہ لونڈی پر ہی ہوتا ہے۔ اس کی جمع قینات ہے۔ حدیث میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قینات کی خرید و فروخت سے منع فرمایا ہے۔ یعنی مغنیہ لونڈیوں کی خرید وفروخت سے۔''

''الصحاح'' کے الفاظ ہیں:

والقينة: الامة المغنية كانت او غير مغنية. (۲۱۸۶/۶)

''قینہ لونڈی کو کہتے ہیں خواہ وہ مغنیہ ہو یا غیر مغنیہ۔''

''الرائد'' میں درج ہے:

القينة: ج قيان. الامة، المغنية. (۱۲۱۴/۲)

''قینہ کی جمع قیان ہے۔ اس کے معنی لونڈی اور گانے والی کے ہیں۔''

''المنجد'' میں ہے:

القينة: ج قيان. الامة، المغنية. (۶۶۷)

''قینہ کی جمع قیان ہے۔ اس کے معنی لونڈی اور گانے والی کے ہیں۔''

''المعجم الوسیط'' میں درج ہے:

القينة: الامة صانعة او غير صانعة وغلب على المغنية. (۷۷۱/۲)

''قینہ لونڈی کو کہتے ہیں خواہ پیشہ ور ہو یا غیر پیشہ ور۔ اس کے غالب معنی مغنیہ کے ہیں۔''

واضح ہوا کہ ان لغات میں سے کوئی ایک لغت بھی ایسی نہیں ہے جس میں 'قینة' کے معنی میں نمایاں طور پر مغنیہ کو بیان نہ کیا گیا ہو۔ اس ضمن میں ''الاعتصام'' کی تحقیق کی مثال ایسے ہی ہے کہ کوئی شخص یہ جملہ پڑھ کر کہ ''اسلام نے شراب کو ممنوع قرار دیا ہے'' یہ حکم صادر فرمائے کہ چونکہ لغت میں لفظ شراب کا ایک معنی پیا جانے والا رقیق مشروب بھی درج ہے، اس لیے ہر چیز جو اس معنی کا مصداق قرار پائے گی، ممنوع ٹھہرے گی۔ اس پر ان صاحب سے کہا جائے گا کہ زبان پر اس قدر ظلم نہ فرمائیے، بلا شبہ لغت میں وہ معنی درج ہیں جو آپ نے ارشاد فرمائے ہیں، مگر جان لیجیے کہ یہ لفظ اپنے عموم میں نشہ آور مشروب کے لیے خاص ہو گیا ہے۔ مزید براں یہ لفظ جس جملے میں آیا ہے، اس کے دیگر الفاظ بھی اسی معنی پر دلالت کرتے ہیں۔ بعینہٖ یہ بات ''الاعتصام'' کی خدمت میں لفظ قینہ کے بارے میں

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

پیش ہے۔ بے شک، اس اسم کا معنی مجرد طور پر لونڈی بھی ہے، مگر اولاً، اس کا عمومی اطلاق مغنیہ لونڈی ہی پر ہوتا ہے اور ثانیاً مذکورہ روایت میں اس کے ساتھ فعل غنا کے استعمال نے اسے مغنیہ ہی کے مفہوم کے ساتھ خاص کر دیا ہے۔

''الاعتصام'' نے اس بحث میں ''لسان العرب'' کے حوالے سے یہ قول بھی نقل کیا ہے: وقال اللیث: عوام الناس یقولون: القینة المغنیة۔ یعنی لیث نے کہا ہے کہ عوام الناس کہتے ہیں کہ القینہ کے معنی مغنیہ ہے۔ یہ قول نقل کر کے اس کی شرح میں لکھا ہے:

> ''غور فرمایا آپ نے کہ 'قینة'' کے معنی مغنیہ کرنا ''عوام الناس'' کا قول ہے، اہل عرب کا نہیں۔ مگر ہمارے یہ متجددین اس کو 'معرف ومعلوم'' معنی قرار دیتے ہیں اور یہ محض ''عوام الناس'' کو دھوکا دینے کے لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں ''پیشہ ور مغنیہ'' نے گانا گایا لہٰذا موسیقی جائز ہوئی۔ (معاذ اللہ)۔'' (۲۱:۵۷/۷)

اس شرح کو پڑھ کر یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ اسے ان کی علمیت کا کمال سمجھا جائے یا دیانت کا۔ اہل الاعتصام غالباً بھول گئے ہیں کہ جس لغت کے حوالے سے انھوں نے یہ قول نقل کیا ہے، وہ لغت کسی عجمی زبان کی نہیں، بلکہ عربی زبان کی ہے اور ہر عربی لغت کی طرح اس میں بھی عربوں ہی کے الفاظ ومعانی درج کیے گئے ہیں۔ چنانچہ اس میں درج کسی لفظ کے وہ معنی ہرگز مراد نہیں ہو سکتے جو اردو، فارسی یا کسی اور زبان میں مستعمل ہیں۔ لہٰذا بصد ادب گزارش ہے کہ یہاں اردو کا ''عوام الناس'' نہیں، بلکہ عربی کا ''عوام الناس'' استعمال ہوا ہے اور اس کا مصداق پاک و ہند کے عام لوگ نہیں، بلکہ عرب کے عام لوگ ہیں۔ مزید براں لغت کی اس کتاب سے مراجعت کرنے والے جانتے ہیں کہ اس میں اگر یہ لکھا ہو کہ 'کثیرا ما یطلق علی الفلان' یا 'غلب علی الفلان' یا 'عوام الناس یقولون فلان' تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ''اہل عرب کے ہاں اس لفظ کا زیادہ تر استعمال فلاں معنی میں ہوتا ہے'' یا ''اہل عرب کے نزدیک اس کے فلاں معنی غالب ہیں'' یا ''عرب کے اکثر لوگ اس کے معنی فلاں کرتے ہیں۔'' چنانچہ لیث کے مذکورہ قول کے معنی یہ ہوں گے کہ عربوں کے عام لوگ یہ لفظ مغنیہ کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ یعنی قینہ کا رائج اور معروف مفہوم مغنیہ ہے۔

''قینہ'' کے معنی کی یہ بحث توقع ہے کہ ''الاعتصام'' کے اطمینان کے لیے کفایت کرے گی، تاہم اگر وہ اس میں کچھ کمی محسوس کریں تو مزید تشفی کے لیے ہم انھی کی برہان قاطع پیش کیے دیتے ہیں۔ ''الاعتصام'' کی جلد ۵۷ کے شمارہ ۱۷ کا صفحہ ۱۳ ملاحظہ کیجیے۔ اسی تنقیدی مضمون کے دوسرے حصے کی پہلی قسط میں قینات کا ترجمہ بقلم خود مغنیات کیا ہے:

> ''حضرت ابوامامہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
>
> لا تبیعوا القینات، ولا تشتروھن ولا تعلموھن.

مغنیات کی خرید وفروخت نہ کرو، اور نہ انھیں (موسیقی) کی تربیت دو۔''

خامہ انگشت بدنداں ہے، اسے کیا لکھیے

'قینتان' کے معنی کی بحث میں ''الاعتصام'' نے دوسری بات یہ فرمائی ہے کہ مذکورہ روایت کے چار طرق میں سے صرف ایک طریق میں 'قینتان' کا لفظ آیا ہے، جبکہ باقی تین طرق میں 'جاریتان' نقل ہوا ہے، لہٰذا 'جاریتان' ہی کے لفظ کو ترجیح دینی چاہیے۔

اس پر ہماری گزارش یہ ہے کہ اہل الاعتصام مسلک اہل حدیث کے ترجمان ہیں، اس لیے یقیناً یہ جانتے ہوں گے کہ کسی روایت کے دو صحیح طرق میں اگر ایک بات مختلف الفاظ سے ادا کی گئی ہو تو تناقض کا سوال اس وقت پیدا ہوتا ہے جب ایک کے الفاظ یا اسالیب دوسری کے نقیض بن رہے ہوں۔ اس صورت میں محدثین داخلی اور خارجی قرائن کی روشنی میں کسی ایک کو ترجیح دیتے ہیں یا دونوں کے بارے میں توقف کا فیصلہ کرتے ہیں۔ لیکن اگر یہ تناقض پیدا نہیں ہوتا تو پھر ایک روایت دوسری کی شرح و وضاحت اور تفصیل و توضیح قرار پاتی ہے۔ چنانچہ 'جاریة' کے ایک معنی اگر لونڈی کے ہیں اور 'قینة' بھی گانے والی لونڈی ہی کو کہتے ہیں تو صاف واضح ہے کہ یہاں کوئی تناقض پیدا نہیں ہوا، بلکہ 'قینتان' کے الفاظ نے 'جاریتان' کے اس ابہام کو دور کر دیا جو باول وہلہ اس کے معنی میں لڑکی کے مفہوم کا اشتراک ہونے کی وجہ سے پیدا ہو رہا تھا۔

تیسری بات یہ فرمائی ہے کہ 'قینتان' والا طریق شعبہ سے مروی ہے اور اس میں شک کا ایک پہلو بھی موجود ہے (کہ وہ عید الفطر کا دن تھا یا عید الاضحیٰ کا)، جبکہ شعبہ ہی کا یہ طریق جب مسند احمد بن حنبل میں رقم ہوا ہے تو اس میں 'قینتان' نہیں، بلکہ 'جاریتان' ہی آیا ہے۔ اس لیے اس سے 'جاریتان' ہی مراد لینا چاہیے۔

سوال یہ ہے کہ کیا اس شک کے پہلو نے روایت کو کم زور کر دیا ہے یا 'قینتان' کے معنی و مصداق میں کوئی ابہام پیدا کیا ہے؟ بہر حال، اطلاعاً عرض ہے کہ شک کے جس پہلو کی بنا پر ''الاعتصام'' نے احمد بن حنبل کی روایت کو بخاری کی روایت پر ترجیح دی ہے، وہی شک کا پہلو بعینہٖ احمد بن حنبل کی روایت میں بھی مذکور ہے۔ ملاحظے کے لیے دونوں روایتیں حسب ذیل ہیں:

بخاری کے الفاظ ہیں:

حدثنا شعبة عن هشام عن ابيه عن عائشة ان ابا بكر دخل عليها والنبی عندها يوم فطر او اضحی وعندها قينتان تغنيان. (رقم ۳۷۱۶)

احمد بن حنبل کے الفاظ ہیں:

...ثنا شعبة عن هشام بن عروة عن ابيه عن عائشة ان ابا بكر دخل عليها ورسول الله عندها يوم فطر او اضحى وعندها جاريتان تضربان بدفين. (رقم ۲۴۷۲۶)

دونوں روایتوں میں 'یوم فطر او اضحی' (عیدالفطر کا دن یا عیدالاضحیٰ کا) کے الفاظ آئے ہیں جو ''شک'' کے مذکورہ پہلو کو دونوں روایتوں میں داخل کررہے ہیں۔

غنا سے مراد

''الاعتصام'' نے لکھا ہے:

''اس غنا سے مراد لہو ولعب میں مبتلا لوگوں کا غنا نہیں بلکہ سادہ طریقہ سے اشعار پڑھنا مراد ہے۔... لہٰذا جب گانے والیاں مغنیہ نہیں تھیں اور جو کچھ گایا وہ بھی غناء معروف میں شمار نہیں ہوتا تو ان کے گانے کو ''عید پر موسیقی'' قرار دینا خود فریبی نہیں تو اور کیا ہے؟ اور اسی دھوکے میں مبتلا ہو کر جو تفریعات قائم کی گئی ہیں ان کی حیثیت ہی کیا رہ جاتی ہے؟

سادہ آواز سے اشعار پڑھنا، بشرطیکہ وہ عشق و معاشقہ کے قبیل سے نہ ہوں، حرب و ضرب کے بارے میں ہوں یا حمد و نعت اور حسن اخلاق کے پہلو سے ہوں، وہ عید کے دن بھی جائز ہیں اور دوسرے ایام میں بھی۔ ایسے اشعار کو غناء محرم سے تعبیر کرنا اور اس سے موسیقی کے جواز کا فتویٰ و فیصلہ کرنا علم نہیں بے علمی کی بدترین مثال ہے۔ جو بچیاں جنگ بعاث کے متعلق اشعار ایام عید میں پڑھ رہی تھیں اور ساتھ دف بھی بجا رہی تھیں، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم چادر لیے رخ دوسری جانب کیے ہوئے لیٹے تھے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے دیکھا تو سمجھا کہ آپ آرام فرما رہے ہیں اور گھر میں یہ تماشا ہو رہا ہے۔ اسی بنا پر اس عمل کو انھوں نے شیطانی ساز فرمایا۔ مگر آپ نے عید کی مناسبت سے اس پر انکار نہ فرمایا کہ یہ خوشی کا دن ہے اور خوشی کے دن اس قدر خوشی کا اظہار ممنوع نہیں مگر اس بنیاد پر عید کے روز ''موسیقی'' کا باقاعدہ ''اہتمام'' اور اس کے لیے معروف ''پیشہ ور مغنیہ'' کو دعوت کا جواز کیسے ثابت ہوا؟''

(۱۸:۵۷/۸)

اس تقریر پر بصد ادب چند سوال پیش خدمت ہیں۔

پہلا سوال یہ ہے کہ 'تغنیان' کے معنی یہ کرنا کہ ''وہ سادہ آواز سے اشعار پڑھ رہی تھیں'' کس بنا پر کیا گیا ہے؟ کسی رائج لفظ کے مفہوم، اطلاق اور مصداق میں تصرف اور اسے نئے معنی پہنانے کا اختیار ہمیں یا آپ کو کس نے دیا ہے؟ اسلامی ادب کی تاریخ میں اس کی نادر مثال پرویز صاحب اور ان کے پیش رو ضرور ہیں جنھوں نے عربی الفاظ و اسالیب

کے ایسے معنی دریافت کیے ہیں جنھیں نہ صرف عربی زبان، بلکہ دنیا کی کوئی اور زبان بھی قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوسکی۔ غور فرمایئے، غنا کے معنی کی تعیین میں آپ کی کاوش کہیں اسی نوعیت کی تو نہیں ہے؟ ازراہ عنایت ملاحظہ فرمالیجیے کہ اہل لغت اس لفظ کے مفہوم کے بارے میں کیا کہتے ہیں:

لسان العرب میں ہے:

والغِنَاء بالکسر من السماع. (۱۳۶/۵)

''غنا بالکسر (غ کی زیر کے ساتھ) کے معنی سماع (موسیقی) ہیں۔''

الصحاح میں ہے:

والغناء بالکسر من السماع. (۲۴۴۹/۶)

''غنا بالکسر (غ کی زیر کے ساتھ) کے معنی سماع (موسیقی) ہیں۔''

المعجم الوسیط میں ہے:

الغناء: التطریب والترنم بالکلام الموزون وغیرہ. (۶۶۵/۲)

''غنا کے معنی سر اور ترنم سے موزوں اور غیر موزوں کلام کو پڑھنا ہے۔''

المنجد میں ہے:

الغناء من الصوت: ما طرب به. (۵۶۱)

''غنا سے مراد گانا گانا ہے۔''

دوسرا سوال یہ ہے کہ یہاں فعل غنا کا مفہوم آپ سادہ آواز میں شعر پڑھنا قرار دے کر اسے جائز قرار دے رہے ہیں، مگر کیا وجہ ہے کہ آگے قرآن کے مباحث میں آپ نے 'لھو الحدیث' اور 'سمد' کے الفاظ کا مصداق اسی فعل غنا کو قرار دے کر اور موسیقی اور گانے بجانے کو اس کے ہم معنی استعمال کر کے اسے باطل اور ممنوع قرار دیا ہے؟ دیکھیے، آپ نے لکھا ہے:

''اس آیت میں ''لھوالحدیث'' سے مراد غناء اور آلات ملاہی ہیں... لھوالحدیث کے لغوی معنی کے اعتبار سے اگر مفسرین نے ہر غافل کر دینے والی چیز مراد لی ہے تو کیا غناء اور موسیقی میں یہی عنصر موجود نہیں؟... مولانا عثمانی مرحوم نے بھی شان نزول کے اعتبار سے ''لھوالحدیث'' کے مفہوم میں گانے بجانے کو خاص طور پر ذکر فرمایا... حضرت مفتی شفیع صاحب نے صاف صاف لکھا ہے کہ آیت مذکورہ میں چند صحابۂ کرام نے تو ''لھوالحدیث'' کی تفسیر گانے بجانے سے کی ہے... ''لھوالحدیث'' سے حقیقۂ غناء و موسیقی اور تمام آلات ملاہی مراد ہیں... ادھر حضرت عبداللہ بن مسعود تین بار قسم اٹھا کر کہ ''مجھے اللہ کی قسم! لھوالحدیث سے مراد غناء ہے۔'' یہی بات حضرت ابن عباس فرمائیں۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

مگر غامدی صاحب فرماتے ہیں ''غناء کی یہ تعیین درست نہیں ۔'' تف ہے ایسے علم پر اور تاسف ہے ایسی عقل و دانش پر... صحابۂ کرام نے تو وضاحت فرمادی کہ وہ موسیقی تھی، کیا وہ عربی لغت اور سیاق کلام سے بے بہرا تھے؟... یہ ''خریدا'' ہوا لھوالحدیث غناء اور مغنیہ نہیں تو اور کیا ہے؟... غناء و موسیقی حق نہیں، بلکہ باطل ہے۔'' (۱۷/۱۴ تا ۱۶، ۱۸/۱۲ تا ۱۶)

''حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ حمیری زبان میں غناء کو 'سمد' کہتے ہیں۔ (جامع الاحکام، ج ۷ اص:۱۲۳: ج ۱۴، ص ۵۱) حافظ ابن کثیر نے بھی تفسیر ج ۴ ص ۳۳۲ میں یہ قول ذکر کیا ہے اور ''قینة'' کو کہا جاتا ہے ''اسمدینا ای الھینا بالغناء'' کہ ہمیں غنا کے ساتھ سے غافل کردو... مفسرین اور فقہا تو اس کے معنی غناء مراد لیتے ہیں اور اس سے غناء کی ممانعت پر دلیل لاتے ہیں۔'' (۱۹/۵۷: ۱۱)

تیسرا سوال یہ ہے کہ اگر 'جاریتان' سادہ الفاظ سے اشعار ہی پڑھ رہی تھیں اور اس میں ترنم یا غنا کی نوعیت کی کوئی چیز نہیں تھی تو کیا وجہ تھی کہ سیدنا ابو بکر نے اسے مزمار الشیطان سے تعبیر کیا؟

چوتھا سوال یہ ہے کہ اسی روایت کے ایک دوسرے طریق جو ابن شہاب زہری سے مروی ہے اور جس میں بقول آپ کے شک کے الفاظ بھی نہیں ہیں، 'تدفان و تضربان' کے الفاظ آئے ہیں یعنی وہ دونوں دف بجا رہی تھیں۔ سوال یہ ہے کہ سادہ آواز سے شعر پڑھنے کے لیے ایسے آلۂ موسیقی کی کیا ضرورت تھی جو غنا کے اہم رکن تال کو پیدا کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے؟

ہماری گزارش ہے کہ یہاں تھوڑی دیر کے لیے رک کر یہ غور فرما لیجیے کہ ہم اصل میں کہہ کیا رہے ہیں۔

دف کی تال پر گیت گانا، صحرائی سفروں میں حدی خوانی کرنا اور لمبی تان کے ساتھ 'نصب' پڑھنا عربوں کے غنا ہی کی مختلف اصناف ہیں، اسی طرح جیسے کلاسیکی موسیقی، نیم کلاسیکی موسیقی، خیال، ٹھمری، غزل، گیت، ماہیا، ٹپا، قوالی وغیرہ برصغیر کے غنا کی اصناف ہیں۔ ان میں جو چیز قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہے، وہ خوش الحانی یا بالفاظ دیگر سر، لے اور تال کے ساتھ آواز کا زیر و بم ہے۔ یہی چیز ہے جو ان اصناف کو زمرۂ غنا میں داخل کرتی ہے۔ چنانچہ قدیم عرب کے کسی حدی خوان کی حدی خوانی کو یا کسی خوش آواز کے نصب پڑھنے کو یا کسی قینہ کے دف کے ساتھ رزمیہ گیت کو اگر موجودہ زمانے کے کسی ماہر فن کے سامنے پیش کیا جائے تو وہ بے تکلف بتا دے گا کہ اس میں کون سا سر اور کون سا راگ استعمال ہوا ہے۔ دور کیوں جایئے، ہمارے بچے روز اسکول میں ''لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری'' راگ بہاگ میں اور ''پاک سرزمین شاد باد'' بلاول ٹھاٹھ میں گاتے ہیں اور ہمیں اس میں کوئی شناعت محسوس نہیں ہوتی۔

ان اصناف کو استعمال کر کے گائی جانے والی چیز اسی صورت میں لغو یا ناجائز قرار پائے گی جب وہ کسی غیر دینی یا غیر اخلاقی داعیے کو پروان چڑھانے والی ہوگی۔ کوئی حدی خوان اگر اخلاق باختہ اشعار گاتا ہے تو اس کی حدی خوانی محض

اس لیے جائز نہیں ٹھہرے گی کہ اس نے غنا کی ایسی صنف کا انتخاب کیا ہے جس کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پسندیدگی کا اظہار فرمایا تھا یا دف کے ساتھ گایا گیا کوئی فحش نغمہ فقط اس بنا پر قابل قبول نہیں ہو گا کہ اسے ایک ایسے آلۂ موسیقی کے ساتھ گایا گیا ہے جس کی اباحت احادیث میں مذکور ہے، بعینہٖ وہ اشعار جو اپنے وجود میں مباح ہیں، فقط اس بنا پر ناجائز نہیں قرار پائیں گے کہ ان کے سرحدی خوانی یا نصب کے سروں سے مختلف ہیں یا انھیں دف کے علاوہ کسی آلۂ موسیقی کے ساتھ گایا گیا ہے۔

ہماری بات کی مزید وضاحت کے لیے دو احادیث ملاحظہ فرمایئے:

۱۔ السنن الکبریٰ للنسائی کی صحیح روایت ہے کہ ایک عورت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ آپ نے سیدہ عائشہ سے پوچھا کہ کیا تم اس عورت کو جانتی ہو؟ سیدہ نے نفی میں جواب دیا۔ اس پر آپ نے فرمایا: 'ھذہ قینة بني فلان تحبين ان تغنيك' (یہ فلاں قبیلے کی مغنیہ لونڈی ہے، کیا تم چاہو گی کہ وہ تمھارے لیے گائے)؟ چنانچہ اس نے سیدہ کو گانا سنایا۔

۲۔ بخاری کی صحیح روایت ہے کہ سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ بعض انصاریوں کی منعقد کردہ غنا اور شراب نوشی کی ایک مجلس میں شریک تھے۔ عنده قينة و اصحابه فقالت في غنائها: الا يا حمز للشرف النواء (ان کے دوست اور ایک مغنیہ لونڈی بھی ان کے پاس موجود تھی تو اس مغنیہ نے گاتے ہوئے کہا کہ حمزہ اٹھو اور ان فربہ اونٹنیوں کو ذبح کر ڈالو)۔ یہ سنتے ہی حضرت حمزہ تلوار لے کر لپکے اور ان کے کوہان کاٹ ڈالے اور پیٹ پھاڑ کر کلیجے نکال لیے۔ اطلاع ملنے پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم وہاں پہنچے تو حضرت حمزہ کو نشے کی حالت میں پایا۔

دیکھیے، پہلے واقعے میں بھی گانا گایا گیا ہے اور دوسرے میں بھی اور دونوں میں اس کے لیے 'غناء' ہی کا فعل استعمال ہوا ہے۔ اسی طرح پہلے واقعے میں بھی مغنیہ لونڈی نے گانا گایا ہے اور دوسرے میں بھی اور دونوں میں اس کے لیے 'قينة' یعنی مغنیہ لونڈی کا اسم استعمال ہوا۔ اس یکسانی کے باوجود ایک واقعے کا غنا جائز قرار پائے گا اور دوسرے کا ناجائز۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ کون سی چیز ہے جس نے ایک ہی فعل کو ایک مقام پر جائز بنا دیا ہے اور دوسرے پر ناجائز۔ بالبداہت واضح ہے کہ شراب نوشی اور اس کے نتائج کے الحاق نے دوسرے موقع پر فعل غنا کو جواز کے دائرے سے نکال کر عدم جواز کے دائرے میں داخل کر دیا۔ احادیث کے اس تقابل سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ غنا اور آلۂ غنا ایسی چیزیں ہرگز نہیں ہیں جنھیں علی الاطلاق ناجائز قرار دیا جائے۔ یہ اصلاً جائز ہیں، البتہ بعض موقعوں پر ان کے لوازم و لواحق اور نتائج و اثرات کی بنا پر ان کے عدم جواز کا حکم بھی لگایا جا سکتا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

شادی بیاہ پر موسیقی

''شادی بیاہ پر موسیقی'' کے زیر عنوان ہم نے ابن ماجہ کی روایت رقم ۱۹۰۰ سے موسیقی کے جواز پر استدلال کیا تھا۔ اس روایت میں ابن عباس کے حوالے سے یہ واقعہ بیان ہوا ہے کہ سیدہ عائشہ نے انصار میں سے اپنی ایک عزیزہ کا نکاح کیا۔تقریب نکاح میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی تشریف لائے۔آپ نے پوچھا کہ کیا لڑکی کو رخصت کرتے ہوئے اس کے ساتھ کوئی گانے والا بھی بھیجا ہے؟ سیدہ عائشہ نے نفی میں جواب دیا تو آپ نے فرمایا کہ انصار گانا پسند کرتے ہیں، یہ بہتر ہوتا کہ اس کے ساتھ کسی گانے والے کو بھیجا جاتا۔

اس روایت سے استدلال کرتے ہوئے ہم نے بیان کیا تھا کہ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ شادی بیاہ کے موقع پر موسیقی کا استعمال سرتاسر مباح ہے۔

''الاعتصام'' نے ہمارے اس استدلال کو اصلاً تسلیم کیا ہے اور لکھا ہے:

> ''شادی کے موقعے پر عورتوں کی مجلس میں لونڈیوں یا بچیوں کا گانا درست ہے بشرطیکہ وہ گیت جائز ہوں، ان میں حسن و جمال کی داستانیں نہ ہوں اور فسق و فجور اور عشق بازی کا تذکرہ نہ ہو۔'' (۱۹:۵۷/۸)

ہمارے استدلال کو بنیادی طور پر مان لینے کے بعد غالباً قاری کی توجہ اصل نکتے سے ہٹانے کے لیے یا اس امر کی یقین دہانی کے لیے کہ ان کے پاس مان کر بھی مان کر نہ دینے کی صلاحیت کا وافر بہرہ موجود ہے، انھوں نے لکھا ہے:

> ''ان متجددین کی یہ بھی کرشمہ سازی ہے کہ ابن ماجہ کی اس روایت کو بطور استدلال پیش کیا، جس سے شاید یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ شادی کے موقع پر گانے والے مردوں کا گانا بھی جائز ہے۔ چنانچہ روایت کے ظاہر الفاظ ''ارسلتم معها من یغنی'' کا ترجمہ ہی یہ کیا گیا کہ کیا ''اس کے ساتھ کوئی گانے والا بھی بھیجا ہے۔''''
> (۱۹:۵۷/۸)

اس کے بعد انھوں نے ایک مفصل بحث میں بتایا ہے کہ یہاں مرد مراد لینا درست نہیں ہے۔

کوئی صاحب علم کیا یہ باور کر سکتا ہے کہ یہ تنقید کسی یقینی مقدمے پر قائم ہی نہیں کی گئی، بلکہ اس امکان کی بنا پر قائم کی گئی ہے کہ ''شاید یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ شادی کے موقعے پر گانے والے مردوں کا گانا بھی جائز ہے۔''

اس کے جواب میں اتنا ہی کافی ہے کہ اس روایت کے تحت ہماری پوری بحث میں مردوں یا عورتوں کے الفاظ کہیں استعمال ہی نہیں ہوئے۔ روایت میں چونکہ اس طرح کی کوئی تخصیص بیان نہیں ہوئی، اس وجہ سے یہ کسی طرح بھی موزوں نہ تھا کہ اسے مردوں یا عورتوں کی تخصیص کے ساتھ بیان کیا جاتا، البتہ روایت میں چونکہ 'من یغنی' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، اس لیے یہ ضروری تھا کہ اس کا ترجمہ صیغۂ تذکیر میں کیا جاتا۔ دنیا کی تمام بڑی زبانوں کا

www.javedahmadghamidi.com www.ghamidi.net

یہ قاعدہ ہے کہ جب جنس کی تخصیص مقصود نہ ہو تو بالعموم مذکر ہی کا صیغہ استعمال ہوتا ہے۔

ایک اور سخن طرازی ملاحظہ فرمایئے:

''مزید براں حضرت عبداللہ بن عباس کی اس روایت کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ''محدثین نے اس روایت کو حسن قرار دیا ہے'' کن محدثین نے؟ کاش اس کی بھی وضاحت کر دی ہوتی۔ جب کہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے... یہ روایت بہر نوع معنعن ہے۔ اس لیے سند کے اعتبار سے اسے حسن قرار دینا قطعاً غلط ہے۔ البتہ اس کے دیگر شواہد کی بنیاد پر یہ روایت حسن، صحیح ہے۔'' (۸/۵۷:۲۰)

سوال یہ ہے کہ اگر آپ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب کسی بات کو حدیث کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے تو پھر جرح کس بات پر ہے، اگر کچھ کہنا ہی تھا تو کیا اتنا کافی نہیں تھا کہ اس روایت کو فلاں سند کے بجائے فلاں سند سے نقل کیا جائے۔

بہر حال، نوٹ فرما لیجیے کہ عصر حاضر کے جلیل القدر محدث علامہ ناصر الدین البانی نے اسے حسن قرار دیا ہے اور اسے اپنی کتاب ''صحیح سنن ابن ماجہ'' کی دوسری جلد میں صفحہ ۱۳۶ پر درج کیا ہے۔ مزید براں یہی روایت اسی مدعا کے ساتھ، مگر الفاظ کے تغیر کے ساتھ صحیح بخاری میں نقل ہوئی ہے اور ہمارے مضمون میں بھی درج ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

جشن پر موسیقی

''جشن پر موسیقی'' کے زیر عنوان ہم نے ایک ہی موضوع کی دو روایتیں نقل کی تھیں۔ ایک روایت ''السیرۃ الحلبیہ'' سے لی گئی تھی۔ اس میں نقل ہوا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے تو عورتوں اور بچوں (النساء و الصبیان) نے گیت گایا۔ دوسری روایت ابن ماجہ کی تھی جس میں بیان ہوا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کے بعد جب مدینہ کی ایک گلی سے گزرے تو بنی نجار کی 'جوار' (لونڈیاں/لڑکیاں) دف بجا کر آپ کی مدح میں گیت گا رہی تھیں۔ آپ نے انھیں سن کر گانے والیوں کے لیے شفقت اور محبت کا اظہار فرمایا۔ حاشیے میں 'جوار' کے معنی کے بارے میں ہم نے یہ تصریح کی تھی کہ یہاں اس کا ترجمہ ''بچیاں'' کرنا درست نہیں ہے، کیونکہ ''المعجم الصغیر'' میں درج اس روایت کے دوسرے طریق میں 'جوار' کے بجائے 'قینات' (مغنیات) نقل ہوا ہے۔

ان روایتوں سے استدلال کرتے ہوئے ہم نے بیان کیا تھا کہ ان کی بنا پر یہ بات پورے اطمینان سے کہی جا سکتی ہے کہ جشن یا خوشی کی تقریب کے موقع پر گیت گائے جا سکتے ہیں اور آلات موسیقی کو استعمال کیا جا سکتا ہے۔

ہماری اس بحث پر ''الاعتصام'' نے تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے:

''جشن موسیقی'' اشراق کے مقالہ نگار بلکہ جناب غامدی صاحب کے اس عنوان پر غور فرمایئے اور پھر بتلایئے کہ جن روایات کی بنیاد پر ''موسیقی'' بلکہ ''جشن موسیقی'' کا جواز ثابت کیا جا رہا ہے، ان سے ہمارے ہاں کا معروف ''جشن موسیقی'' کیوں کر جائز قرار دیا جا سکتا ہے؟ جس میں لہر بہر، عیش ونشاط اور ناچ رنگ کے وہ تمام طریقے اختیار کیے جاتے ہیں جن کا اسلام سے دور کا بھی واسطہ نہیں اور جن سے سفلی جذبات بھڑکتے اور حیوانی جبلت ابھرتی ہے، اور وہ جشن بالآخر من تو شدی تو من شدم کا منظر ومظہر بن جاتا ہے۔'' (۹/۷ ۵:۱۴)

اس تنقید کی حقیقت کو جاننے کے لیے ہمارا خیال ہے کہ فقط یہی دو اطلاعات کافی ہوں گی:

اولاً، ہمارے پورے مضمون میں عنوان کے طور پر یا متن کے اندر ''جشن موسیقی'' کے الفاظ کہیں استعمال نہیں کیے گئے۔ جس عنوان کو ''الاعتصام'' نے ''جشن موسیقی'' قرار دے کر درج بالا مضمون آفرینی کی ہے، وہ ''جشن موسیقی'' نہیں ہے، بلکہ ''جشن پر موسیقی'' ہے۔ زبان وبیان سے ادنیٰ واقفیت رکھنے والا شخص بھی یہ پکار اٹھے گا کہ ان دونوں عنوانات میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ''جشن موسیقی'' کا مطلب ہے کہ موسیقی کا جشن منایا جا رہا ہے اور ''جشن پر موسیقی'' سے مراد ہے کہ کسی قومی یا علاقائی جشن کی تقریبات کے موقع پر موسیقی کا استعمال کیا جا رہا ہے۔ تاہم، کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ مذکورہ ترکیب میں لفظ ''پر'' پر نظر نہ پڑنے کو سہو سے تعبیر کرنا چاہیے، مگر سوال یہ ہے کہ اس عنوان کے تحت درج اس کا یہ مدعا کیونکر ایک ایسے مصنف کی نظروں سے اوجھل ہو سکتا ہے جس نے تنقید کے لیے قلم اٹھایا ہے:

> ''روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں داخل ہوئے تو اہل مدینہ نے آپ کا فقید المثال استقبال کیا۔ مدینے میں جشن برپا تھا۔ ہر چھوٹا بڑا آپ کی آمد کی خوشی میں مسرور تھا۔ اس موقع پر عام عورتوں اور بچوں اور مغنیات نے دف بجا کر استقبالیہ نغمے بھی گائے، جنھیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پسند فرمایا۔ چنانچہ ان کی بنا پر یہ بات پورے اطمینان سے کہی جا سکتی ہے کہ جشن یا خوشی کی تقریب کے موقع پر گیت گائے جا سکتے ہیں اور آلات موسیقی کو استعمال کیا جا سکتا ہے۔'' (اشراق مارچ ۲۰۰۴/ ۲۶)

ثانیاً، سوال یہ ہے کہ ایسے جشن موسیقی کو جس میں بقول ''الاعتصام'' ''وہ تمام طریقے اختیار کیے جاتے ہیں جن کا اسلام سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے اور جن سے سفلی جذبات بھڑکتے اور حیوانی جبلت ابھرتی ہے''، کس نے جائز قرار دیا ہے اور ایک ایسے مضمون پر جس کے مختلف مندرجات نہایت صراحت کے ساتھ اس تاثر کی نفی کرتے ہیں، یہ مفہوم چسپاں کرنا دین واخلاق کی رو سے کہاں کی دیانت ہے؟ اگر یہ تنقید اسی مضمون پر کی گئی ہے تو واضح رہے کہ اس میں بیان ہوا ہے کہ:

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

''انسانی نفس کو آلودہ کرنے والے اعمال کو قرآن 'فحشاء'، 'منکر' اور 'بغی' سے تعبیر کرتا ہے اور انھیں ہر لحاظ سے ممنوع قرار دیتا ہے۔ انسانی نفس کو آلودہ کرنے والے یہ منکرات و فواحش اگر کسی مباح عمل سے منسلک ہو جائیں تو بعض اوقات اسے بھی دائرۂ شناعت میں داخل کر دیتے ہیں۔ چنانچہ شاعری اور موسیقی جیسی مباح چیزوں کے ساتھ شرک، زنا اور شراب جیسے ممنوعات شریعت وابستہ ہو کر انھیں شنیع بنا سکتے ہیں۔'' (اشراق مارچ ۲۰۰۴/ ۴۱)

''اسلام کی رو سے موسیقی کی وہ اصناف شنیع قرار پائیں گی جن سے منکرات و فواحش وابستہ ہو جائیں یا جو انسان کے اندر ہیجان پیدا کرنے اور سفلی اور شہوانی جذبات کو انگیخت کرنے کا باعث بنیں۔ عامۃ الناس کو بہر حال ان سے اجتناب کی تلقین کی جائے گی۔'' (اشراق مارچ ۲۰۰۴/ ۴۷)

''مفسدین نے لوگوں کو قرآن سے دور کرنے اور خرافات میں مشغول کرنے کے لیے لہو ولعب کے جو ذرائع اختیار کیے ہوں گے، وہ اس زمانے کے لحاظ سے ظاہر ہے کہ خطبات، کھیل تماشے، موسیقی کی محفلیں اور مشاعرے ہی ہو سکتے ہیں۔ یہ ذرائع اگر لوگوں کو دین سے برگشتہ کرنے کے لیے اختیار کیے جائیں تو فی نفسہٖ مباح ہونے کے باوجود اپنے غلط استعمال کی وجہ سے شنیع قرار پائیں گے اور اہل ایمان کو ان سے گریز ہی کی تلقین کی جائے گی۔''

(اشراق مارچ ۲۰۰۴/ ۶۲)

''ہمارے نزدیک قرآن مجید نے (سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۶۴ میں) 'صوت' کا لفظ استعمال کر کے ان تمام ہتھکنڈوں کی طرف اشارہ کیا ہے جو شیطان صوت رحمان کے مقابل میں پیش کرتا اور ان کے ذریعے سے اللہ کے بندوں کو گم راہی کی طرف مائل کرتا ہے۔ اس پہلو سے دیکھیے تو ہر وہ چیز صوت شیطان ہے جو انسان کو اس کے پروردگار سے سرکشی یا دوری کا درس دیتی ہے۔ یہ درس اگر کوئی تقریر، کوئی تعلیم، کوئی شاعری اور کوئی موسیقی دیتی ہے تو وہ بلاشبہ صوت شیطان ہے اور اسلام اسے کسی حال میں گوارا نہیں کر سکتا۔'' (اشراق مارچ ۲۰۰۴/ ۶۸)

عنوان پر تنقید کے بعد وہ اس کے متن کو بھی زیر بحث لائے ہیں۔ دیگر مباحث کی طرح یہاں بھی انھوں نے اصل بنائے استدلال پر بات کرنے کے بجائے چند ضمنیات ہی کو موضوع بنانے پر اکتفا کیا ہے۔ چنانچہ دیکھیے، ہمارا بنیادی استدلال ابن ماجہ کی صحیح روایت کی بنا پر یہ تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی خوشی میں باندیوں نے آلۂ موسیقی دف بجا کر گیت گائے اور آپ نے ان سے شفقت و محبت کا اظہار فرمایا۔ اس سے واضح ہے کہ گانا اور آلات موسیقی اگر فی نفسہٖ باطل ہوتے تو آپ نہ صرف یہ کہ پسندیدگی کا اظہار نہ کرتے، بلکہ اس سے منع بھی فرماتے، لہٰذا اس موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل موسیقی کے جائز ہونے کی صریح دلیل ہے۔

اس استدلال کو زیر بحث لانے سے گریز کرتے ہوئے انھوں نے ہماری نقل کردہ روایتوں کی اسناد پر بحث کی

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

ہے اور اس ضمن میں ابن ماجہ کی مذکورہ روایت کو صحیح ماننے کے باوجود ساری قوت اس پر صرف کی ہے کہ زیر بحث واقعے کی توضیح کے لیے مزید براں جو دو روایتیں ہم نے ''السیرۃ الحلبیہ'' اور ''المعجم الصغیر'' سے نقل کی ہیں، وہ سند کے اعتبار سے صحیح نہیں ہیں۔

اس تنقید کے جواب میں یہ بحث کی جا سکتی ہے کہ اگر ضعیف روایت کی تائید صحیح روایت کر رہی ہو تو علما کے نزدیک وہ لائق استدلال قرار پاتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ابن کثیر، شبلی نعمانی، سلیمان سلمان منصور پوری، ابوالاعلیٰ مودودی اور صفی الرحمٰن مبارک پوری جیسے معروف سیرت نگاروں کے حوالے بھی پیش کیے جا سکتے ہیں جنھوں نے اپنی کتابوں میں ان واقعات کو بعینہٖ نقل کیا ہے، مگر اس لاطائل تکرار سے گریز کرتے ہوئے ہم ان دو روایتوں کے ضعف کے حوالے سے ''الاعتصام'' کی تنقید کو تسلیم کرتے ہیں۔ اس کے باوجود مسئلہ یہ ہے کہ ہمارا استدلال اپنی تمام جزئیات کے ساتھ اب بھی پوری طرح قائم ہے۔ چنانچہ اسی کی جانب متوجہ کرنے کے لیے اہل الاعتصام کی خدمت میں یہ سوال ہے کہ اگر انھیں یہ تسلیم ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دف کے ساتھ گائے جانے والے گیتوں کو سن کر ان پر نکیر نہیں فرمائی، بلکہ گانے والیوں سے شفقت کا اظہار کیا تو پھر وہ کیا دلیل ہے جس کی بنا پر موسیقی اور آلات موسیقی کی اباحت کا انکار کیا جا رہا ہے اور اس کی حرمت کا حکم لگایا جا رہا ہے؟

ہمارے اصل استدلال سے صرف نظر کرتے ہوئے ''الاعتصام'' نے ایک اور نکتہ بھی پیدا کیا ہے، فرمایا ہے:

''آپ کی تشریف آوری پر یہ جو کچھ ہوا، وہ بچوں اور لونڈیوں کا معاملہ تھا۔ اسے معروف معنی میں ''جشن آمد'' قرار دینا کسی صحیح دلیل سے ثابت نہیں۔'' (الاعتصام ۹/ ۵۷: ۱۵)

اس کے جواب میں ہمارا خیال ہے کہ سیرت کی کتابوں کے یہ اقتباس کفایت کریں گے:

''آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے استقبال اور دیدار کے لیے سارا مدینہ اُمڈ پڑا تھا۔ یہ ایک تاریخی دن تھا جس کی نظیر سرزمین مدینہ نے کبھی نہ دیکھی تھی... یہ نہایت تابناک تاریخی دن تھا۔ گلی کوچے تقدیس وتحمید کے کلمات سے گونج رہے تھے اور انصار کی بچیاں خوشی ومسرت سے ان اشعار کے نغمے بکھیر رہی تھیں: اشرق البدر علینا من ثنیات الوداع...'' (الرحیق المختوم، صفی الرحمٰن مبارک پوری ۲۴۰)

''شہر میں آپ کا استقبال جس جوش وخروش اور جس والہانہ انداز میں ہوا وہ بے نظیر تھا۔ عرب میں نہ اس سے پہلے کبھی کسی کا ایسا استقبال ہوا تھا نہ اس کے بعد ہوا... بیہقی نے دلائل میں اور ابوبکر المقری صاحب المعجم الکبیر نے کتاب الشمائل میں یہ روایت بیان کی ہے کہ عورتیں چھتوں پر چڑھ کر یہ گیت گا رہی تھیں: طلع البدر علینا من ثنیات الوداع...'' (سیرت سرور عالم ابوالاعلیٰ مودودی ۲/ ۷۴۴)

سفر میں موسیقی

اس عنوان کے تحت ہم نے بخاری کی روایت رقم ۳۹۶۰ نقل کی تھی۔ اس میں بیان ہوا ہے کہ رات کے وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں مسلمانوں کا لشکر خیبر کی طرف روانہ ہوا۔ دوران سفر میں لوگوں میں سے ایک آدمی نے حدی خوان شاعر عامر بن الاکوع سے حدی خوانی کی فرمایش کی، چنانچہ انھوں نے جنگ میں کامیابی کے لیے دعائیہ اشعار گانے شروع کیے۔ ان کی آواز سن کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ یہ گانے والا کون ہے؟ لوگوں نے کہا کہ عامر بن الاکوع ہیں۔ آپ نے ان کے لیے رحمت کی دعا فرمائی۔

اس روایت سے استدلال کرتے ہوئے ہم نے لکھا تھا کہ ''حدی خوانی'' صحرائی نغمے کی ایک صنف ہے۔ قدیم عرب میں ساربان صحراؤں میں سفر کرتے ہوئے حدی خوانی کرتے تھے۔ اس کا اصل مقصد تو اونٹوں کو مست کر کے انھیں تیز رفتاری کی طرف مائل کرنا ہوتا تھا، مگر شتر سوار بھی اس سے پوری طرح حظ اٹھایا کرتے تھے۔ اس کے بارے میں حدیث کی کتابوں میں متعدد روایتیں موجود ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام بھی صحرائی سفروں کے دوران میں حدی خوانی سے محظوظ ہوتے تھے۔ بعض صحیح روایتوں میں مذکور ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خوش آواز حدی خوان انجشہ کو اپنے سفروں کے لیے مقرر کر رکھا تھا۔

اس بحث پر ''الاعتصام'' نے ''حدی خوانی'' کے مفہوم کے بارے میں چند حوالے نقل کرنے پر اکتفا کی ہے۔ ان سے مقصود غالباً یہ ثابت کرنا ہے کہ حدی خوانی غنا یا موسیقی سے کوئی مختلف صنف ہے۔ چنانچہ انھوں نے لکھا ہے:

> ''حدی خوانی اصل میں اہل بادیہ کا گانا ہے، اسے معروف غناء اور گانے کے مروجہ اسلوب سے کوئی مناسبت نہیں۔ علامہ الجوہری نے بھی لکھا ہے کہ حدی خوانی دراصل ''سوق الابل والغناء لھا'' اونٹوں کو چلانے اور ان کے لیے گانے کا نام ہے اور یہی کچھ دیگر ائمۂ لغت نے لکھا ہے۔ حافظ ابن حجر رقم طراز ہیں: حدی خوانی سے ایسے غناء کا جواز ثابت ہوتا ہے جس میں لمبی آواز نکالی جاتی ہے، جسے نصب کہتے ہیں۔'' (۱۶:۵۷/۹)

یہ بات، صریح طور پر ہمارے موقف کی تائید کر رہی ہے، مگر تعجب ہے کہ ''الاعتصام'' نے اسی کو تنقید کے لیے پیش کیا ہے۔ حدی خوانی اگر غنا ہے جیسا کہ تمام حوالوں میں تسلیم کیا گیا ہے تو کیا فقط یہی روایت جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے حدی خوانی کی سماعت ثابت ہے، غنا کے جواز پر دلیل قاطع نہیں ہے؟

یہ کہاں کی منطق ہے کہ اگر کوئی بدوی نغمہ سرا ہو تو جائز اور حضری نغمہ سرا ہو تو ناجائز، لمبی آواز نکال کر شتر سواروں کے مخصوص سر میں گائے تو درست اور کسی دوسرے سر میں گائے تو غلط، فطری صلاحیت کی بنا پر خوش الحانی کرے تو

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

قبول اور اگر اکتساب فن کے بعد خوش الحانی کرے تو رد!

آلات موسیقی

اس عنوان کے تحت ہم نے بخاری کی روایت رقم ۳۷۷۹ نقل کی تھی۔ اس میں بیان ہوا ہے کہ سیدہ ربیع بنت معوذ کی شادی کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ہاں تشریف لائے۔ اس وقت باندیاں دف پر بدر کے مقتولین کا نوحہ گا رہی تھیں۔ ان میں سے ایک باندی نے گاتے ہوئے کہا کہ اس وقت ہمارے درمیان وہ نبی موجود ہیں جنھیں آنے والے دنوں کی باتیں بھی معلوم ہیں۔ اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ نہ کہو، بلکہ وہی کہو جو پہلے کہہ رہی تھی۔

اس روایت سے استدلال کرتے ہوئے ہم نے لکھا تھا کہ یہ عرب میں کثرت سے استعمال ہونے والے آلۂ موسیقی دف کے جواز پر دلالت کرتی ہے۔ اہل عرب کے ہاں خوشی کی تقریبات میں گیتوں کے ساتھ اس کا استعمال عام تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اسے مختلف موقعوں پر بجایا گیا اور آپ نے اس پر نکیر نہیں فرمائی۔

ہمارے اس نقطۂ نظر پر ''الاعتصام'' نے جو تنقید کی ہے، اسے تین نکات میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ پہلا نکتہ یہ ہے کہ دف اگرچہ آلات موسیقی میں شامل ہے، مگر اس سے تمام آلات موسیقی کے جواز پر استدلال درست نہیں ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''محض دف سے تمام ''آلات موسیقی'' کا جواز کہاں سے در آیا؟ آپ زیادہ سے زیادہ اسے ''آلۂ موسیقی'' کہہ سکتے ہیں۔ محض اس کی بنیاد پر تمام ''آلات موسیقی'' کا جواز ہمارے متجددین کا علمی کرشمہ ہے۔'' (۹/۵۷:۱۵)
>
> '''''دف'' آٹا یا گندم صاف کرنے والی چھلنی کی مانند ہوتا تھا۔ اس کے ساتھ گھنگرو بندھے ہوئے ہوں تو وہ دف نہیں آلۂ موسیقی ہوتا ہے۔ پھر نکاح کی تقریب ہو یا عید کا روز یا کوئی اور خوشی کا موقع ان میں صرف دف ہی بجائی جاتی تھی۔ دف سے تمام ''آلات موسیقی'' کا جواز ثابت کرنا علم وعقل کے اعتبار سے قطعاً غلط ہے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ ان مواقع پر دف کا ہی ذکر ہے، باقی ''آلات'' کا کیوں نہیں؟'' (۹/۵۷:۱۷)

درج بالا اقتباس سے واضح ہے کہ اہل الاعتصام دف کو زمرۂ آلات موسیقی میں شامل سمجھتے اور اس کے جواز کو تسلیم کرتے ہیں۔ تاہم وہ اسے ایک استثنائی معاملہ قرار دیتے ہوئے دیگر آلات موسیقی کے عدم جواز کا حکم لگاتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اہل الاعتصام آلات موسیقی کو حرام لذاتہ سمجھتے ہیں یا حرام لغیرہ؟ اگر ان کے نزدیک یہ حرام لذاتہ کے زمرے میں آتے ہیں یعنی اپنی ذات ہی میں حرام ہیں تو پھر ان میں سے کسی ایک کا استثنا کس دلیل کی بنا پر ہے؟ اور

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

اگر یہ حرام لغیرہ ہیں یعنی خود تو حرام نہیں ہیں، لیکن کسی دوسری علت کے باعث دائرۂ حرمت میں داخل ہیں تو پھر وہ کون سی علت ہے جو انھیں دائرۂ حرمت میں شامل کرتی ہے اور دف میں وہ علت کیونکر موجود نہیں ہے؟

یہی سوال ایک دوسرے زاویے سے بھی زیر غور آ سکتا ہے کہ اگر کوئی چیز علی الاطلاق یعنی اپنے وجود ہی کی بنا پر حرام ہے تو پھر اس کے کسی جز یا کسی مظہر کا استثنا کیونکر جائز ہے؟ شراب علی الاطلاق حرام ہے، لہٰذا وہ اپنے تمام اجزا اور تمام مظاہر میں حرام ہو گی۔ یہی معاملہ سود اور جوئے کا ہے۔ چنانچہ یہ کیسے ممکن ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم آلات موسیقی کو علی الاطلاق حرام سمجھتے ہوں اور اس کے باوجود اس کے کسی جز کے استعمال کی اجازت دے دیں۔ ایسی اجازت صرف اضطرار کی حالت میں ہوتی ہے جب جان، مال یا آبرو کو کوئی بڑا خطرہ لاحق ہو۔ ظاہر ہے کہ آلۂ موسیقی کے سماع کی نوعیت ایسی ہرگز نہیں ہے۔ چنانچہ جملہ آلات موسیقی کے بارے میں یہی کہا جائے گا کہ یہ اصلاً مباح ہیں، تاہم اگر کسی موقع پر کوئی حرام چیز ان سے منسلک ہو گی تو وہ اس وقت ان کی اباحت کو حرمت میں تبدیل کر دے گی۔ کرکٹ، ہاکی، فٹ بال اور اس جیسے دوسرے کھیلوں کے مباح ہونے میں کیا شبہ ہے، لیکن اگر یہ کبھی جوئے کے لیے استعمال ہونے لگیں تو ان کا کھیلنا ناجائز قرار دیا جائے گا۔ اسی طرح شعر و ادب کی اباحت مسلم ہے، لیکن یہ اگر شرک و الحاد اور فسق و فجور کی ترویج کا باعث ہوں گے تو یقیناً ناجائز قرار پائیں گے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

دوسری بات یہ فرمائی ہے:

''امام الحلیمی فرماتے ہیں:

وضرب الدف لا یحل الا للنساء لانه فی الاصل من اعمالھن، وقد لعن رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم المتشبھین من الرجال بالنساء۔ (شعب الایمان ج۴، ص:۲۸۳) ''دف بجانا صرف عورتوں کے لیے حلال ہے کیوں کہ یہ دراصل انھی کا عمل ہے، جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان مردوں پر لعنت فرمائی ہے جو عورتوں کی مشابہت اختیار کرتے ہیں۔''

پس دف یا گانے کا یہ شغل صرف لونڈیوں اور بچیوں کے لیے ہے، آزاد عورتوں اور مردوں کے لیے نہیں۔ اور وہ بھی سادہ طریقہ پر نہ کہ غناء کی معروف صورت میں۔'' (۸/۵۷:۲۰)

یہ تنقید غالباً بہت عجلت میں لکھی گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صاحب تصنیف کو یہ اندازہ ہی نہیں ہوا کہ ان کے قلم سے باہم متضاد باتیں صادر ہو گئی ہیں۔ امام الحلیمی کے جس قول کو استدلال کی بنیاد بنایا ہے، وہ یہ ہے کہ ''دف بجانا صرف عورتوں (النساء) کے لیے حلال ہے'' اور اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ''پس دف یا گانے کا یہ شغل صرف لونڈیوں اور بچیوں کے لیے ہے، آزاد عورتوں اور مردوں کے لیے نہیں۔'' گویا بنائے استدلال یہ ہے کہ عورتوں کے لیے دف بجانا جائز

ہے اور نتیجۂ استدلال ہے کہ عورتوں کے لیے دف بجانا ناجائز ہے ـــــ یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے۔

بہر حال ہمارا استدلال دو لفظوں میں یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آلۂ موسیقی دف بجایا گیا اور آپ نے اس کی نکیر نہیں فرمائی۔ اگر اہل الاعتصام آلات موسیقی کو حرام قرار دینا چاہتے ہیں تو انھیں اس روایت اور اس نوعیت کی دیگر صحیح روایتوں کی تردید کرنی ہوگی۔

پھر سوال یہ ہے کہ اگر دف بجانا ''آزاد عورتوں اور مردوں'' کے لیے حرام ہے، جیسا کہ بیان کیا گیا ہے تو حرمت کی وجہ دف بذات خود ہے یا اسے بجانے والوں کی جنس اور عمر؟ اگر دف بذات خود ہے تو اسے کسی استثنا کے بغیر، ہر حال میں حرام ہونا چاہیے اور آزاد عورتوں اور مردوں کے ساتھ ساتھ لونڈیوں اور بچیوں کا اسے بجانا بھی دائرۂ حرمت میں آنا چاہیے، لیکن اگر اس کی وجہ جنس ہے تو پھر لونڈی کا دف بجانا بھی اس کے جنس عورت سے متعلق ہونے کی بنا پر حرام قرار پائے گا۔ بصورت دیگر ''الاعتصام'' کو لونڈی کے لیے عورت کے بجائے کوئی اور جنس اختراع کرنی ہوگی۔ اس مقصد کے لیے ہوسکتا ہے کہ انھیں عرف ولغت سے ماورا کوئی نئی تحقیق پیش کرنی پڑے، مگر قارئین جانتے ہیں کہ اگر عزم وہمت ہو تو یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ اس کام کے لیے ان کے پاس وافر بہرہ موجود ہے۔ ''جاریہ''، ''قینہ'' اور ''غنا'' کے بارے میں ان کے نوادر تحقیق اسی عزم وہمت کا شاہ کار ہیں۔

مزید براں، مردوں کے دف بجانے کی حرمت کا سبب اگر عورتوں سے مشابہت کا مسئلہ ہے جیسا کہ امام الحلیمی کے حوالے میں مذکور ہے تو پھر اس کا اطلاق صرف مردوں پر ہوگا، آزاد عورتوں پر ہرگز نہیں ہوگا۔ تاہم، اس میں یہ سوال اپنی جگہ باقی رہے گا کہ مشابہت کا استدلال کس اصول کی بنا پر کیا گیا ہے۔

اس مسئلے پر مزید بحث گراں باری خاطر کا باعث ہوسکتی ہے، اس لیے ہم اس سوال کے ساتھ اسے ختم کرتے ہیں کہ دف کو بجانے کے معاملے سے قطع نظر اس کی سماعت کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ انھی روایتوں سے کیا یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس آلۂ موسیقی کو بلا استثنائے جنس، مردوں، عورتوں اور بچوں نے سنا۔ پیغمبر نے بھی سنا اور آپ کے صحابہ اور صحابیات نے بھی۔ چنانچہ اگر سماع دف مباح ہے تو اسی نوع کے دوسرے آلات موسیقی کا سماع کیوں مباح نہیں ہے؟

تیسری بات یہ فرمائی ہے:

''موسیقی نواز حضرات کا دف کے جواز سے تمام ''آلات موسیقی'' کو جائز قرار دینا سراسر دھوکا ہے بلکہ آگے بڑھ کر یہ کہنا کہ ''موجودہ زمانے میں عرف اور حالات کے مطابق کوئی دوسرا طریقہ بھی اختیار کیا جا سکتا ہے'' گویا جس کے پاس جس قدر وسائل ہیں، وہ آلات موسیقی اور پیشہ ور گانے والوں کو اپنے ہاں مدعو کر کے مجلس موسیقی منعقد کر سکتا

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

ہے۔رقص وناچ سے لطف اندوز ہوسکتا ہے۔اناللہ وانا الیہ راجعون۔یہ اسلام کی ترجمانی نہیں ''اسلام سازی'' ہے اور خدمت اسلام کی بجائے ''مرمت اسلام'' ہورہی ہے۔'' (۹/۵۷:۱۷)

''الاعتصام'' نے یہ مضمون آفرینی ہماری جس بات پر کی ہے، وہ ابن ماجہ کی ایک حدیث اور اس پر حاشیے میں درج توضیحی نوٹ ہے۔ہم نے لکھا ہے:

''بعض روایتیں دف کے جواز سے آگے بڑھ کر نکاح کے موقع پر اس کے لزوم کو بھی بیان کرتی ہیں۔مثلاً: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نکاح کے حلال اور حرام میں فرق یہ ہے کہ دف بجایا جائے اور بلند آواز سے اعلان کیا جائے۔شریعت کی رو سے خفیہ نکاح باطل قرار پاتا ہے۔چنانچہ نکاح کا اعلان شرائط نکاح میں شامل ہے۔اسی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانے میں نکاح کے موقع پر دف بجانے کو ضروری قرار دیا۔سنن البیہقی الکبریٰ کی ایک روایت میں یہی بات تفصیل سے بیان ہوئی ہے:

''حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کے ہم راہ بنی زریق کے پاس سے گزرے۔اس موقع پر آپ نے ان کے گانے بجانے کی آواز سنی۔آپ نے پوچھا: یہ کیا ہے؟ لوگوں نے جواب دیا: یارسول اللہ، فلاں شخص کا نکاح ہورہا ہے۔آپ نے فرمایا: اس کا دین مکمل ہوگیا۔نکاح کا صحیح طریقہ یہی ہے۔نہ بدکاری جائز ہے اور نہ پوشیدہ نکاح۔یہاں تک کہ دف کی آواز سنائی دے یا دھواں اٹھتا ہوا دکھائی دے۔حسین نے کہا ہے اور مجھ سے عمرو بن یحییٰ المازنی نے بیان کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پوشیدہ نکاح کو ناپسند کرتے تھے یہاں تک کہ اس میں دف بجایا جائے۔'' (رقم ۱۴۴۷۷)

نکاح کے موقع پر موسیقی کے استعمال کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانے اور تمدن کے لحاظ سے ضروری قرار دیا۔موجودہ زمانے میں عرف اور حالات کے مطابق کوئی دوسرا طریقہ بھی اختیار کیا جاسکتا ہے۔'' (اشراق ۳۱)

یہ ہے وہ بیان جس کی بنا پر ''الاعتصام'' نے درج بالا نتائج اخذ کیے ہیں۔زبان سے معمولی واقفیت رکھنے والا شخص بھی یہی کہے گا کہ اس سے مذکورہ نتائج اخذ کرنا علم ونظر کا افلاس ہے۔ہم نے یہ نہیں لکھا کہ نکاح کے موقع پر دف کے استعمال کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لازم قرار دیا، بلکہ یہ لکھا ہے کہ نکاح کے موقع پر اس کے اعلان کے لیے موسیقی کے استعمال کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ضروری قرار دیا۔اور اس کے بعد یہ بیان کیا ہے کہ موجودہ زمانے میں کوئی دوسرا طریقہ بھی اختیار کیا جاسکتا ہے۔موسیقی کے مقابل میں دوسرا طریقہ کے الفاظ اس امر کو لازم کرتے ہیں کہ ان کا مصداق لازماً موسیقی سے مغایر ہونا چاہیے، یہ ظاہر ہے کہ لاؤڈ اسپیکر، اخبار میں اشتہار یا شادی کارڈ وغیرہ تو ہوسکتا ہے، موسیقی کی کوئی صنف یا آلۂ موسیقی ہرگز نہیں ہوسکتا۔

فن موسیقی

اس عنوان کے تحت ہم نے جو روایت نقل کی تھی، اس میں بیان ہوا ہے کہ ایک عورت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ آپ نے سیدہ عائشہ سے فرمایا کہ کیا تم اس عورت کو جانتی ہو؟ سیدہ نے نفی میں جواب دیا۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ یہ فلاں قبیلے کی قینہ (مغنیہ) ہے، کیا تم اس کا گانا پسند کرو گی؟ اور پھر اس نے سیدہ کو گانا سنایا۔

اس روایت سے استدلال کرتے ہوئے ہم نے بیان کیا تھا کہ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فن موسیقی کو اصلاً باطل نہیں سمجھتے تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو آپ اس ماہر فن مغنیہ کو ٹوک دیتے یا کم سے کم سیدہ کو اس کا گانا ہر گز نہ سننے دیتے۔ یہ بات مسلم ہے کہ حبشہ کے غلام اور لونڈیاں رقص و موسیقی کے فنون میں مہارت رکھتے تھے۔ وہ اکثر عربوں کی تقریبات میں شریک ہوتے رہتے تھے۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ انھی میں سے بعض نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا اور آپ نے اس پر نکیر نہیں فرمائی۔

مذکورہ روایت کے تحت جو حوالہ ہم نے نقل کیا ہے، وہ سنن البیہقی الکبریٰ، رقم ۸۹۶۰ ہے۔ یہ درحقیقت السنن الکبریٰ للنسائی، رقم ۸۹۶۰ ہے۔ پروف کی غلطی سے نسائی کے بجائے بیہقی لکھا گیا ہے۔ ''الاعتصام'' نے اس جانب متوجہ کرنے کے لیے ''غلط حوالہ'' کے عنوان سے جلی سرخی قائم کی ہے اور اس کے تحت ایک نوٹ میں اپنے خاص انداز سے اس کی نشان دہی کی ہے۔ اس طرح کی پروف اور تدوین کی غلطیاں معتدبہ تعداد میں خود ''الاعتصام'' کے مضمون میں بھی موجود ہیں اور جواب آں غزل کے طور پر 'غلط حوالہ'، 'غلط ترجمہ'، 'غلط اعراب'، 'غلط املا'، 'غلط محاورہ' اور 'غلط اوقاف' کے عنوانات قائم کر کے ان کی نشان دہی بھی کی جا سکتی ہے، مگر ظاہر ہے کہ یہ طریق مکالمے اور علمی تبادلۂ خیال کی فضا کو متاثر کر سکتا ہے، اس لیے ہم اس سے قطع نظر کرتے ہوئے اس نشان دہی پر ''الاعتصام'' کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ آیندہ اشاعت میں ان شاء اللہ اس کی تصحیح ہو جائے گی۔

اس روایت سے ہمارے استدلال پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ہم علامہ الزمخشری، علامہ الجوہری رحمہم اللہ وغیرہ کے حوالے سے ذکر کر آئے ہیں کہ ''قینة'' دراصل لونڈی کو کہتے ہیں، ماہر فن اور پیشہ ور مغنیہ کو نہیں۔ لہٰذا جب وہ ''پیشہ ور'' تھی ہی نہیں، لونڈی تھی، اس کے گانے کا انداز ''ماہر فن مغنیہ'' کا نہیں، اونچی آواز سے شعر پڑھنے کا تھا، چنانچہ اس نے وہ اشعار پڑھے۔ سیدہ عائشہ نے وہ اشعار سنے۔''
>
> (۱۱/۵۷: ۱۷)

قینہ کے مفہوم اور اطلاق کی بحث تو گزشتہ صفحات میں فیصل ہو چکی ہے، تاہم ''الاعتصام'' کے اس نوٹ پر کہ ''اس کے گانے کا انداز ماہر فن مغنیہ کا نہیں، اونچی آواز سے شعر پڑھنے کا تھا، چنانچہ اس نے وہ اشعار پڑھے۔ سیدہ عائشہ

نے وہ اشعار سنے،'' چند سوال پیدا ہوتے ہیں۔

پہلا سوال یہ ہے کہ یہ اطلاع کہاں سے ملی ہے کہ اس قینہ کا انداز اونچی آواز میں شعر پڑھنے کا تھا؟ مذکورہ روایت میں تو ایسا کوئی لفظ استعمال نہیں ہوا جس کا معنی 'شعر' یا 'اونچی آواز' کیا جا سکے؟ اس کے الفاظ تو فقط یہ ہیں: تحبین ان تغنیك؟ فغنتھا۔ (کیا تم اس کا غنا سننا چاہو گی؟ چنانچہ اس نے انھیں غنا سنایا) گویا یہاں فقط غنا کا فعل استعمال ہوا جس کے معلوم اور معروف معنی گانا گانے کے ہیں۔ اسی سے مغنی اور مغنیہ بنا ہے جس کے معنی گلوکار اور گلوکارہ کے ہیں۔ چنانچہ وہ کون سی داخلی یا خارجی دلیل ہے جس کی بنا پر یہ تحقیق پیش کی گئی ہے؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ شعر اور آواز کے بلند آہنگ کو آپ نے غنا کے مصداق سے الگ کیسے کر لیا ہے۔ ناشناسی کی اگر یہی نوعیت ہے تو کسی راہ چلتے سے معلوم کر لیجیے، وہ بادنیٰ تامل بتا دے گا کہ اشعار کو آواز کے زیر و بم کے ساتھ پڑھنا غنا ہی تو ہے۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ آپ کی دانست میں جب قینہ کے معنی گانے والی کے نہیں، بلکہ عام لونڈی کے ہیں اور اس نے اونچی آواز سے شعر پڑھنے ہی پر اکتفا کی ہے تو پھر آپ کے قلم سے ''اس کے گانے کا انداز'' کے الفاظ کیوں نکل گئے ہیں؟ آپ نے یہ کیوں نہیں لکھا کہ ''اس کے کہنے کا انداز'' یا ''اس کے پڑھنے کا انداز''؟ کہیں معاملہ وہی تو نہیں ہے کہ:

کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے، تو چھپائے نہ بنے

تنقید کو آگے بڑھاتے ہوئے ''الاعتصام'' نے لکھا ہے:

''السنن الکبریٰ للنسائی میں حضرت سائب کی یہ روایت تو انھیں نظر آ گئی مگر مسند امام احمد اور المعجم الکبیر لطبرانی میں حضرت سائب کی یہ روایت نظر نہ آئی، جس میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ جب وہ لونڈی گانے لگی

''فقال النبی صلی اللّٰه علیه و سلم: ((قد نفخ الشیطان فی منخریها))'' تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''شیطان نے اس کے نتھنوں میں پھونک ماری ہے۔'' یہی روایت علامہ ہیثمی نے مجمع الزوائد (ج: ۷، ص ۱۳۰) میں بھی ذکر کی اور فرمایا: ''رواه احمد و الطبرانی و رجال احمد رجال الصحیح'' ''اسے امام احمد اور طبرانی نے روایت کیا ہے اور مسند احمد کے راوی الصحیح کے راوی ہیں... جس سے یہ بات نصف النہار کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لونڈی کے گانے پر نفرت اور ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور فرمایا کہ ''اس کے نتھنوں میں شیطان پھونک لگاتا ہے۔'' مگر افسوس اہل اشراق بڑی سادگی بلکہ عیاری سے مکمل روایت سے آنکھیں بند کر کے یہ باور کرانے کے درپے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے گانے پر کراہت کا اظہار نہیں فرمایا... شیطان کے ساتھ اس کی تشبیہ اس کی کراہت کی بین دلیل ہے، مگر افسوس وہ تو اہل اشراق کو نظر ہی

www.javedahmadghamidi.com www.ghamidi.net

نہیں آتی۔'' (۱۱/۷۵:۱۷)

اس عبارت کو پڑھ کر ہم اہل الاعتصام سے التجا کرتے ہیں کہ اپنے مزعومہ تصورات کے اثبات کے لیے علم بھینٹ چڑھتا ہے تو چڑھا دیجیے، حق کا کتمان ہوتا ہے تو کر دیجیے، اخلاقیات کی دھجیاں بکھرتی ہیں تو بکھیر دیجیے، مگر خدا کے لیے کم سے کم پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کے معاملے میں بہت احتیاط سے کام لیجیے۔ اس معاملے میں ہمارا اور آپ کا رویہ یہ ہونا چاہیے کہ زبان کٹ جائے، قلم ٹوٹ جائے، مگر ایک لفظ بھی ایسا نہ نکلے جو اس عظیم المرتبت کی شان سے فروتر ہو۔ اس لیے کہ اسی کی ذات والا صفات ہے جس پر دین کا مدار ہے اور اسی کی ہستی ہے جس کا قول و عمل دین کا منبع و ماخذ ہے۔ دیکھیے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف میں سے وہ وصف جسے آپ کی اتباع نہ کرنے والوں نے بھی تسلیم کیا ہے، آپ کے قول و فعل میں کامل ہم آہنگی ہے۔ آپ نے جو کچھ کہا، آپ کا عمل ہمیشہ اس کے عین مطابق رہا اور جو کچھ آپ نے کیا، اس کے برعکس کوئی ایک قول بھی مورخین دریافت نہیں کر سکے۔ چنانچہ یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ غنا کو آپ شیطان سے منسوب قرار دیں اور اس بنا پر اسے ناپسندیدہ اور لائق نفرت سمجھیں اور پھر یہی غنا اپنی زوجۂ محترمہ کو سنوائیں یا زوجۂ محترمہ کو غنا سنوانے کے بعد آپ اسے باطل اور شیطانی عمل قرار دیں۔ ایسے تضاد فکر و عمل کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ـــــــ ہمیں آپ کے دینی اخلاص پر اطمینان اور رسول اللہ کے ساتھ آپ کی محبت پر یقین ہے، مگر غور کیجیے، یہاں آپ سے کیا صادر ہوا ہے۔ آپ کی درج بالا تعبیر کو اگر مان لیا جائے تو اس کے معنی یہ بنتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عمل کی اجازت دی اور معاً بعد اسی کے خلاف قول صادر فرما دیا۔ معاذ اللہ

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

ہماری رائے یہ ہے کہ اگر 'قد نفخ الشیطان فی منخریها' کو روایت کا جز قرار دینا ہے اور اس سے وہی مراد لینا ہے جسے ''الاعتصام'' نے بیان کیا ہے تو پھر یہ زیادہ بہتر ہے کہ اس روایت کو رد کر دیا جائے تاکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی ایسی بات منسوب نہ ہو جو ادنیٰ درجے میں بھی تضاد بیانی کا تاثر دے۔ تاہم، ہمارے نزدیک اس کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس جملے کا مفہوم وہ ہے ہی نہیں جو ''الاعتصام'' نے بیان کیا ہے۔ وہ تھوڑا سا تردد کر کے اگر لغت سے رجوع کر لیتے تو انھیں معلوم ہو جاتا کہ 'نفخ الشیطان فی منخریه' یا 'نفخ الشیطان فی انفه' اصل میں بیانیہ جملہ نہیں، بلکہ محاورہ ہے جو بالعموم کسی کے کمال کو بیان کرنے کے لیے بولا جاتا ہے اور اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے اس حد تک تجاوز کیا جس حد تک جانا اس کے لیے مناسب نہ تھا۔

دیکھیے، تاج العروس میں ہے:

نفخ الشیطان فی انفہ: یقال للمتطاول الی ما لیس لہ.(۲/۲۸۳)	''یہ اس شخص کے لیے بولا جاتا ہے جو اس حد تک پہنچ جائے جو حقیقت میں اس کے لیے نہ ہو۔''

اقرب الموارد میں بیان ہوا ہے:

نفخ الشیطان فی انفہ: تطاول الی ما لیس لہ.(۲/۱۳۲۶)	''شیطان نے اس کے ناک میں پھونک ماری یعنی اس نے اپنے متعلق ایسی بڑھ چڑھ کر باتیں کہیں جو درحقیقت اس میں نہیں تھیں۔''

یہاں یہ بھی واضح رہے کہ عربی زبان کے استعمالات میں شیطان کا لفظ حرمت یا شناعت کے مفہوم میں صریح نہیں ہے۔روایتوں میں اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض چیزوں کو شیطان کی نسبت سے بیان فرمایا،مگر اس سے آپ کا مقصود انھیں حرام یا شنیع قرار دینا ہرگز نہیں تھا۔بخاری کی روایات،رقم ۳۰۴۶، ۳۰۴۹ میں بیان ہوا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ 'التثاؤب من الشیطان' (جماہی شیطان کی طرف سے ہے)،'الحلم من الشیطان' (خواب شیطان کی طرف سے ہے)۔اسی طرح ترمذی،رقم ۱۹۳۵ میں ہے: 'العجلة من الشیطان' (جلد بازی شیطان کی طرف سے ہے)۔مسلم،رقم ۷۸۹ میں ہے:الکلب الاسود الشیطان' (کالا کتا شیطان ہوتا ہے)۔مسلم،رقم ۲۴۹۱ میں آپ کے یہ الفاظ بھی نقل ہوئے ہیں:ان المرأة تقبل صورة شیطان و تدبر فی صورة شیطان' (عورت شیطان کی صورت میں آتی اور شیطان کی صورت میں لوٹتی ہے)۔ترمذی،رقم ۱۵۹۷ میں ہے:الراکب شیطان والراکبان شیطانان (ایک سوار ایک شیطان ہے اور دو سوار دو شیطان ہیں)۔ترمذی ہی کی ایک اور روایت،رقم ۲۶۷۲ میں آپ کے یہ الفاظ درج ہیں:العطاس والنعاس والتثاؤب فی الصلاة والحیض والقیء والرعاف من الشیطان (نماز میں چھینک اور جماہی اور حیض،قے اور نکسیر شیطان کی طرف سے ہے)۔

اس ساری بحث کے باوجود 'نفخ الشیطان فی منخریھا' کے حوالے سے ہماری رائے یہ ہے کہ یہ جملہ اگر سند کے اعتبار سے اس لائق ہے کہ اسے روایت کا حصہ تصور کیا جائے تو پھر بھی قرین قیاس یہی ہے کہ اسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب کرنے کے بارے میں توقف کیا جائے۔اس لیے کہ یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمومی ذوق کے خلاف محسوس ہوتی ہے کہ آپ غنا جیسی چیز کے بارے میں تحسین کا اسلوب اختیار کریں گے جو بہرحال اشتغال بالادنیٰ کے زمرے میں آتی ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.ghamidi.net

رقص

ہم نے اپنے مضمون میں تین ایسی روایتیں نقل کی ہیں جن میں 'زفن' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

مسلم کی روایت رقم ۸۹۲ میں سیدہ عائشہ کے الفاظ ہیں:

جاء حبش یزفنون فی یوم عید فی المسجد فدعانی النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم فوضعت راسی علی منکبہ فجعلت انظر الی لعبہم .

''ایک مرتبہ عید کے روز حبشی مسجد میں رقص کا مظاہرہ کرنے لگے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بلایا۔ میں نے آپ کے شانے پر سر رکھا اور ان کا کرتب دیکھنے لگی۔''

احمد بن حنبل، رقم ۱۲۵۶۲ میں حضرت انس سے روایت ہوا ہے:

کانت الحبشة یزفنون بین یدی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ویرقصون ویقولون: "محمد عبد صالح".

''حبشہ کے لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ناچ رہے تھے اور یہ گا رہے تھے: محمد صالح انسان ہیں۔''

ترمذی، رقم ۳۶۹۱ میں سیدہ عائشہ کے حوالے سے بیان ہوا ہے:

کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم جالسا فسمعنا لغطا وصوت صبیان فقام رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فاذا حبشیة تزفن والصبیان حولها فقال یا عائشة تعالي فانظری.

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ہمارے درمیان) تشریف فرما تھے۔ یک بہ یک ہم نے بچوں کا شور سنا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو گئے۔ پھر (ہم نے دیکھا کہ) ایک حبشی عورت ناچ رہی تھی۔ بچے اس کے اردگرد موجود تھے۔ آپ نے فرمایا: عائشہ، آ کر دیکھو۔''

ان روایتوں میں ہم نے 'زفن' کے معنی ناچ اور رقص کے کیے ہیں اور اس بنا پر یہ استدلال کیا ہے کہ یہ فن بھی موسیقی کی طرح زمرۂ مباحات میں شامل ہے۔ لہٰذا اس کی علی الاطلاق حرمت کا حکم صادر نہیں کیا جا سکتا۔ اس نقطۂ نظر پر ''الاعتصام'' کی تنقید حسب ذیل ہے:

''''زفن'' کے معنی رقص نہیں بلکہ رقص کی طرح اچھلنے اور پاؤں اوپر نیچے کرنے کے ہیں... حبشیوں کا ''زفن'' چلنے کی ایک قسم ہے جو لڑائی کی ابتدا میں چلی جاتی ہے۔ اس کے معنی اگر رقص بلکہ ''ماہر فن رقاص'' کے ہیں تو پھر کہنا چاہیے کہ اس فن کا مظاہرہ مسجد میں ہونا چاہیے۔ مسجدیں اللہ تعالیٰ کے ذکر و عبادت اور تعلیم و تعلم کے لیے نہیں، بلکہ ماہرین فن رقص کے لیے بھی کھلی رہنی چاہییں۔ کیونکہ حضرت عائشہ ہی کی روایت میں ہے کہ ''جاء حبش یزفنون

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

فی یوم عید فی المسجد'' الخ (مسلم ج:۱،ص:۲۹۲) ''حبشی لوگ عید کے روز مسجد میں ''رقص'' کر رہے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بلایا تو میں نے اپنا سر آپ علیہ الصلاۃ والسلام کے کندھے پر رکھا اور میں ان کے کھیل کی طرف دیکھنے لگی۔''... اگر ''حبشیة تزفن'' سے ''ماہرفن رقاصہ'' مراد ہے ''حبش یزفنون'' کے معنی بھی ''ماہرفن رقاص'' ہونا چاہیے اور اس ''فن رقص'' کا مظاہرہ مسجد میں ہونا چاہیے اور انھیں معاذ اللہ ''Dancing club'' قرار دینا چاہیے۔'' (۱۱/۵۷:۱۹)

جذبات کو انگیخت کرنے والی اس تقریر میں ہمارے استدلال پر نقد کی اگر کوئی بات ہے تو وہ فقط یہ ہے کہ ''زفن کے معنی رقص نہیں، بلکہ رقص کی طرح اچھلنے اور پاؤں اوپر نیچے کرنے کے ہیں''۔ یہ اسی طرح کی بات ہے کہ کوئی شخص کہے کہ تناول کرنے کے معنی کھانے کے نہیں، بلکہ کوئی چیز منہ میں ڈال کر چبانے اور پھر نگل لینے کے ہیں۔ بہرحال اس تنقید کی اساس چونکہ لفظ 'زفن' کا لغوی مفہوم ہے، اس لیے اس کی تردید کے لیے یہی کافی ہوگا کہ چند نمائندہ لغات کے حوالے یہاں درج کر دیے جائیں۔ ان حوالوں میں یہ بات قارئین کے لیے دلچسپی کا باعث ہوگی کہ ان میں سے بعض میں جہاں 'یزفنون' کا معنی 'یرقصون' کیا گیا ہے، وہاں حوالے کے طور پر سیدہ عائشہ کی درج بالا حدیث ہی نقل کی گئی ہے:

الزفن: الرقص،... و منه حدیث عائشة، رضی اللّٰه عنها: قدم وفد الحبشة فجعلوا یزفنون ویلعبون ای یرقصون. (لسان العرب ۱۳/۱۹۷)	''زفن کے معنی رقص کے ہیں.... حضرت عائشہ کی روایت ہے کہ حبشہ کے لوگوں کا وفد آیا تو وہ ناچنے اور کھیلنے لگ پڑے یعنی رقص کرنے لگ پڑے۔''
الزفن اللعب والدفع. و منه حدیث عائشة، رضی اللّٰه عنها: قدم وفد الحبشة فجعلوا یزفنون ویلعبون ای یرقصون. (النہایہ، ابن اثیر ۲/۳۰۵)	''زفن کا معنی کھیلنا اور دھکا دینا ہے۔ حضرت عائشہ کی روایت ہے کہ حبشہ کے لوگوں کا وفد آیا تو وہ ناچنے اور کھیلنے لگ پڑے یعنی رقص کرنے لگ پڑے۔''
الزفن: الرقص (الصحاح ۵/۲۱۳۱)	''زفن کے معنی رقص کے ہیں۔''
زفن زفنا: رقص. و فلانا: دفعه. (المعجم الوسیط ۱/۳۹۵)	''زفن کے معنی ناچنے اور کسی کو دھکا دینے کے ہیں۔''
زفن: یزفن زفنا: رقص. ه: دفعه. (الرائد ۱/۷۷۷)	''زفن کے معنی ناچنے اور کسی کو دھکا دینے کے ہیں۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

زفن : رقص. (المنجد ۳۰۱) ''زفن کے معنی ناچنا ہیں۔''

اس روایت کی بحث میں ہم نے بیان کیا تھا:

''بعض دوسری روایتوں سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ماہر فن مغنی اور مغنیات اور رقاص اور رقاصائیں عرب میں موجود تھیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کے فن سے لطف اندوز ہونے کو معیوب نہیں سمجھتے تھے۔''

اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ''الاعتصام'' نے لکھا ہے:

''ہم ان کی اس جسارت پر اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے استغفار کرتے ہیں، الفاظ کی جادوگری اور مینا کاری سے انھوں نے جو اوراق سجائیں ہیں اور اپنی ذہنی عیاشی کو جواز بخشنے کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ماہرین فن کے غناء اور پیشہ ور رقاصاؤں کے رقص سے ''لطف اندوز'' ہونے کا علی الاطلاق جو ثبوت انھوں نے پیش کیا، وہ ان کی اپنی کج بحثی بلکہ کج فہمی کا نتیجہ ہے۔'' (۱۱/۵۷:۱۸)

مذکورہ جملے سے ہمارا مدعا ہرگز وہ نہیں ہے جسے ''الاعتصام'' نے اخذ کیا ہے۔ ہمارے مدعا کے لحاظ سے اگر اس جملے کو پڑھا جائے تو یہ اس طرح ہوگا:

''ماہر فن مغنی اور مغنیات اور رقاص اور رقاصائیں عرب میں موجود تھیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم (لوگوں کے) ان کے فن سے لطف اندوز ہونے کو معیوب نہیں سمجھتے تھے۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

یہاں یہ بات پوری طرح واضح رہنی چاہیے کہ ہم نے اپنے مضمون میں رقص و موسیقی یا دیگر فنون لطیفہ کی طرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذاتی میلان کا کوئی تاثر ظاہر نہیں کیا۔ ہمارے نزدیک یہ بات مسلم ہے کہ کھیل تماشے، شعر و شاعری اور مصوری و موسیقی جیسی چیزوں سے آپ کی ذات اقدس ہمیشہ بالا رہی ہے۔ روایتوں میں بعض فنون لطیفہ کا ذکر اگر آپ کی نسبت سے آیا بھی ہے تو ان سے فقط ان فنون کی اباحت معلوم ہوتی ہے، پسندیدگی اور اشتغال کا ادنیٰ درجے میں بھی کوئی تاثر نہیں ہوتا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ فنون لطیفہ من جملۂ مباحات ہیں اور الہامی شریعتوں نے انھیں کبھی ممنوع قرار نہیں دیا، مگر اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کے اسالیب جب حد اعتدال سے متجاوز ہو جائیں تو یہی مباحات نمود و نمایش، فخر و استکبار اور اشتغال بالادنیٰ کا مظہر بن جاتے اور انسان کو آخرت سے غافل کر کے دنیا پرستی کی طرف راغب کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ کے نبی ان میں مستغرق ہونے اور انھیں اوڑھنا بچھونا بنا لینے کو ناپسند کرتے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے ایسی چیزوں کو اصلاً جائز قرار دیا، انھیں اوڑھنا بچھونا بنا لینے کو ناپسند کیا اور اپنے طبعی میلان اور منصبی ذمہ داریوں کی وجہ سے اپنی ذات کی حد تک ان سے

بالعموم گریز ہی کا رویہ اختیار کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے اپنے مضمون کا اختتام ہی دیلمی کی اس روایت پر کیا ہے کہ زید بن ارقم بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے ایک نوجوان گیت گاتا ہوا گزرا تو آپ نے اسے مخاطب ہو کر فرمایا: یاشاب هلا بالقرآن تغنی؟ ''اے نوجوان تو قرآن کو غنا سے کیوں نہیں پڑھ لیتا؟''

خوش الحانی کی تحسین

اس عنوان کے تحت ہم نے بخاری کی روایت رقم ۴۷۶۱ نقل کی تھی۔ اس میں بیان ہوا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوموسیٰ اشعری کی خوش الحانی کے ساتھ تلاوت سن کر ارشاد فرمایا کہ تجھے تو قوم داؤد کے سازوں میں سے ایک ساز دیا گیا ہے۔

اس روایت سے استدلال کرتے ہوئے ہم نے بیان کیا تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے تحسین فرمانے کا سبب خوش الحانی ہے۔ یہ چیز ظاہر ہے کہ تلاوت کے علاوہ بھی کہیں موجود ہوگی تو پسندیدہ ٹھہرے گی۔ چنانچہ اللہ کی حمد وثنا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مدحت یا دیگر اچھے مضامین کے اشعار کو اگر خوش الحانی سے پڑھا جائے تو ان سے محظوظ ہونے میں کوئی قباحت نہیں سمجھی جائے گی۔ مزید براں اس روایت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے 'مزامیر آل داؤد' کے الفاظ مثبت انداز سے استعمال فرمائے ہیں۔ ان کے استعمال سے آپ نے گویا سیدنا داؤد علیہ السلام اور ان کی قوم کے بارے میں بائیبل کی ان روایات کی تصدیق فرما دی ہے جن کے مطابق وہ اللہ کی حمد وثنا کے لیے آلات موسیقی استعمال کیا کرتے تھے۔

ہمارے اس نقطۂ نظر پر ''الاعتصام'' کی تنقید حسب ذیل ہے:

> ''روایت میں ''مزمار'' کا لفظ آیا ہے جس سے ظاہر بینوں اور موسیقی پرستوں کو دھوکا لگا، اسی بنا پر اس کا یہاں معنی ''ساز'' کیا گیا اور محرف بائیبل کے بعض بیانات کی بنیاد پر یہ بھی کہا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بائیبل کی تصدیق فرما دی جن کے مطابق وہ اللہ کی حمد وثنا کے لیے آلات موسیقی استعمال کرتے تھے۔ بلاشبہ ''مزمار'' کے معنی ساز کے ہیں۔ لیکن اس سے مراد یہاں حسن صوت ہے... یوں نہیں کہ حضرت ابوموسیٰ ''مزمار'' بجاتے اور قرآن پڑھتے تھے یا حضرت داؤد علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کے گیت آلات موسیقی پر گاتے تھے... علاوہ ازیں حضرت عبداللہ بن عمر سے مروی ہے کہ مشرق سے دو آدمی مدینہ طیبہ حاضر ہوئے، انھوں نے وعظ کیا تو صحابۂ کرام نے ان کے واعظ وخطبہ پر بڑے تعجب کا اظہار کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ 'بعض بیان جادو ہوتا ہے۔'' یہاں بھی خوش بیانی اور حسن صوت کو جادو سے تعبیر کیا گیا ہے۔ تو کیا یہاں بھی یہ کہا جائے گا کہ آپ نے خوش بیانی

اور خوش الحانی کو جادو سے تعبیر کیا اور آپ نے مثبت انداز میں ان کی خوش الحانی کے جادو کا ذکر کیا۔ لہٰذا جادو اور سحر بھی حرام نہیں۔ حالاں کہ معمولی سمجھ بوجھ رکھنے والا انسان بھی جانتا ہے کہ دونوں جگہ صرف خوش الحانی کی تحسین و توصیف ہے مزامیر یا سحر کی نہیں۔'' (۱۱/۵۷: ۲۳۔۲۴)

اس تقریر دل پذیر پر ہماری فقط دو گزارشات ہیں۔

اولاً، یہ ہم نے کہاں بیان کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مذکورہ تحسین آمیز کلمات سے مراد خوش الحانی یا حسن صوت نہیں، بلکہ مزمار (ساز) ہے۔ ہم نے تو اس روایت کا عنوان ہی ''خوش الحانی کی تحسین'' قائم کیا ہے اور اس کے تحت نہایت صراحت کے ساتھ یہ لکھا ہے کہ ''نبی صلی اللہ علیہ وسلم خوش الحانی کو پسند فرماتے تھے۔'' یہ نہیں لکھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مزامیر یا آلات موسیقی کو پسند فرماتے تھے۔ چنانچہ اس ضمن میں سوائے اس کے کیا کہا جا سکتا ہے کہ ایسی بات کے لیے لغت میں کذب، دروغ، جھوٹ، بہتان اور بد دیانتی کے الفاظ مستعمل ہیں۔

جہاں تک مزامیر آل داؤد کی تصدیق کے حوالے سے ہماری بات کا تعلق ہے تو اس ضمن میں ہمارا حسن ظن یہی ہے کہ غالباً ہماری بات اہل الاعتصام کی سمجھ میں نہیں آسکی۔ ہم اس کی مزید وضاحت کیے دیتے ہیں۔ ہم نے بیان کیا تھا:

> ''مزامیر آل داؤد کے الفاظ کے استعمال سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے گویا سیدنا داؤد علیہ السلام اور ان کی قوم کے بارے میں بائیبل کی ان روایات کی تصدیق فرما دی ہے جن کے مطابق وہ اللہ کی حمد و ثنا کے لیے آلات موسیقی استعمال کیا کرتے تھے۔''

ہمارا یہ استدلال اگرچہ بہت سادہ ہے، مگر ہم مزید وضاحت کے لیے حدیث ہی سے اس کی ایک مثال پیش کر دیتے ہیں۔ توقع ہے کہ اس کے بعد ہماری بات سمجھ میں آجائے گی۔

بخاری کی روایت رقم ۱۳۱۹ میں بیان ہوا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر میرے پاس احد پہاڑ کے برابر سونا ہو تو میں اسے ضرورت مندوں میں تقسیم کر دوں۔ اس روایت کی بنا پر اگر یہ کہا جائے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ سے اس بات کی تصدیق ہو گئی ہے کہ کرۂ ارض پر احد نام کا پہاڑ پایا جاتا ہے تو یہ غلط نہ ہو گا۔ 'مزامیر آل داؤد' کے الفاظ سے ہمارے استدلال کو ایسے ہی سمجھنا چاہیے۔

اس بحث کے ساتھ ہی ''احادیث اور موسیقی'' کے باب پر ''الاعتصام'' کی تنقید پایۂ تکمیل کو پہنچتی ہے۔

[باقی]

---

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

خالد مسعود

بنی اسرائیل میں ایک عظیم رسول کی آمد کی خبر

[جناب خالد مسعود صاحب کی تصنیف ''حیات رسول امی'' سے انتخاب]

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

——— ۲ ———

انجیلوں میں آسمانی بادشاہت کا تذکرہ

انجیلوں کی موجودہ حیثیت اگرچہ ایک قابل بحث موضوع ہے، لیکن چونکہ عیسائی دنیا چار انجیلوں کو قابل اعتماد قرار دیتی اور ان کے مذہبی رہنما ان کی حقانیت کے قائل ہیں، اس لیے دوسرے ادیان کے ماننے والے، خواہ ان کی استنادی حیثیت کے بارے میں ان سے مختلف رائے رکھتے ہوں، انھیں ان کتابوں سے متعلق کسی مسئلہ پر تحقیق کرتے وقت بہرحال انھی کتابوں کے بیان پر اعتماد کرنا پڑتا ہے۔

انجیلوں کا قاری ان میں بارہا استعمال ہونے والی اصطلاح 'آسمان کی بادشاہی' (Kingdom of Heaven) کی طرف متوجہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس کا ذکر عیسیٰ علیہ السلام کے ہم عصر نبی یحییٰ علیہ السلام نے بھی کیا ہے اور حضرت مسیح علیہ السلام اس کو مختلف معانی میں بار بار استعمال کرتے ہیں۔ کہیں وہ اس سے محض نبوت مراد لیتے ہیں یعنی نبی پر ایمان لانے والا گویا آسمان کی بادشاہی میں داخل ہو جاتا ہے۔ اور کہیں اہل ایمان کی آخری سرفرازی یعنی جنت میں داخلہ کو آسمان کی بادشاہی میں داخلہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ دونوں مواقع عبارت کے سیاق و سباق پر غور کرنے سے بآسانی متعین کیے جا سکتے ہیں۔ ان دو استعمالات کے علاوہ انھوں نے آسمان کی بادشاہی کے نزدیک آ جانے کا نہایت قوت سے پرچار کیا، اس پرچار کو اپنی آمد کا مقصد قرار دیا اور اس بادشاہی کی خصوصیات کو متعدد

تمثیلوں کی مدد سے سمجھایا۔ یہود کو بالخصوص خبردار کیا کہ اگر وہ اس بادشاہی میں داخل نہ ہوئے تو وہ ملعون قوم ٹھہریں گے۔ آسمان کی اس بادشاہی کا اطلاق عام نبوت پر ہوتا ہے نہ آخرت کے انجام پر، لہٰذا یہ ان دونوں سے مختلف کوئی چیز ہے۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام کی منادی

انجیل متی کو کھولیے تو حضرت یحییٰ (یوحنا) علیہ السلام آسمانی بادشاہی کے نزدیک آ جانے کی خبر دیتے نظر آتے ہیں۔ ان کی منادی یہ ہوا کرتی کہ ''توبہ کرو، کیونکہ آسمان کی بادشاہی نزدیک آ گئی'' (متی ۳:۲) انھوں نے یہود کے دو مشہور گروہوں ـــــ صدوقیوں اور فریسیوں ـــــ کو مخاطب کر کے متنبہ کیا کہ:

> ''اے سانپ کے بچو، تم کو کس نے جتا دیا کہ آنے والے غضب سے بھاگ سکو گے۔ پس توبہ کے موافق پھل لاؤ اور اپنے دلوں میں یہ کہنے کا خیال نہ کرو کہ ابراہیم ہمارا باپ ہے، کیونکہ میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا ان پتھروں سے ابراہیم کے لیے اولاد پیدا کر سکتا ہے۔ اور اب درختوں کی جڑ پر کلہاڑا رکھا ہوا ہے۔ پس جو درخت اچھا پھل نہیں لاتا وہ کاٹا اور آگ میں ڈالا جاتا ہے۔ میں تو تم کو توبہ کے لیے پانی سے بپتسمہ دیتا ہوں، لیکن جو میرے بعد آتا ہے، وہ مجھ سے زور آور ہے۔ میں اس کی جوتیاں اٹھانے کے لائق نہیں۔ وہ تم کو روح القدس اور آگ سے بپتسمہ دے گا۔ اس کا چھاج اس کے ہاتھ میں ہے اور وہ اپنے کھلیان کو خوب صاف کرے گا اور اپنے گیہوں کو تو کھتے میں جمع کرے گا، مگر بھوسی کو اس آگ میں جلائے گا جو بجھنے کی نہیں۔'' (متی ۳: ۷۔ ۱۲)

اس خطاب میں حضرت یحییٰ علیہ السلام یہود کو خبردار کر رہے ہیں کہ ان کے لیے جو وقت آگے آ رہا ہے، اس سے وہ اپنی جان صرف اس صورت میں بچا سکتے ہیں کہ وہ اپنے نسب پر غرور کرنے کے بجائے توبہ کریں اور آسمانی بادشاہی کو قبول کریں۔ ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ان کے سوا اور بھی ہے، جو اگرچہ وحی والہام سے بے بہرہ ہونے کے باعث پتھروں کے حکم میں ہے، لیکن اللہ تعالیٰ ان کو دین کی وراثت منتقل کر سکتا ہے۔ چونکہ بنی اسرائیل خداوند تعالیٰ سے کیے گئے اپنے عہد کو پورا کرنے سے قاصر رہے ہیں، اس لیے اب ان کا وجود عبث ہے۔ اگر وہ توبہ نہیں کریں گے تو ان کو ایک بے ثمر درخت کی مانند کاٹ دیا جائے گا۔ میرے بعد آنے والا پیغمبر ایمان لانے والوں کے لیے تو سلامتی لائے گا، لیکن مخالفین کو جہنم رسید کرنے کا باعث ہو گا۔ وہ میری طرح پانی سے بپتسمہ نہیں دے گا، بلکہ روح القدس اور آگ سے بپتسمہ دے گا، یعنی وحی الٰہی پر ایمان لانے کی دعوت دے گا اور جو لوگ اس کا انکار کریں گے، ان کا دماغ آگ سے درست کرے گا۔ جنگ کے لیے آگ کا استعارہ نہایت معروف ہے۔ ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اس اقتباس کو منطبق کرنا ممکن نہیں۔ وہ بنی اسرائیل میں سے تھے، پانی سے بپتسمہ دیتے تھے، یوحنا کی طرح یہود کو تنبیہ

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

کرتے کرتے ان کی عمر گزری اوران کی زندگی میں جنگ کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔حضرت یحییٰ علیہ السلام کے الفاظ 'جو میرے بعد آتا ہے' سے بھی یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ اس اقتباس کا مصداق حضرت عیسیٰ ہیں ۔ کیونکہ وہ آں جناب کے ہم عصر تھے اور متی کی روایت کے مطابق اس خطاب کے وقت بذات خود حضرت یحییٰ کی خدمت میں موجود بپتسمہ کی درخواست کر رہے تھے ۔ (متی ۳:۱۳) لہٰذا ماننا چاہیے کہ ایک پیغمبر کی رسالت کی خوش خبری پہلے حضرت یحییٰ نے دی اوراسی کو زیادہ واشگاف الفاظ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے سنایا، جیسا کہ متی کے اگلے ابواب میں ہے۔گویا آسمانی بادشاہت کے نزدیک آجانے سے مراد اس موعود پیغمبر کی بعثت کا زمانہ قریب آجانا تھا۔

حضرت مسیح کی منادی

حضرت یحییٰ کو رومی گورنر نے گرفتار کر لیا تو

''اس وقت سے یسوع نے منادی کرنا اور یہ کہنا شروع کیا کہ توبہ کرو، کیونکہ آسمان کی بادشاہی نزدیک آ گئی ہے۔'' (متی ۴:۱۷)

یہ خوش خبری آں جناب نے کسی ایک جگہ نہیں، بلکہ علاقے میں گھوم پھر کر ہر جگہ دی:

''اور یسوع تمام گلیل میں پھرتا رہا اوران کے عبادت خانوں میں تعلیم دیتا اور بادشاہی کی خوش خبری کی منادی کرتا رہا۔'' (متی ۴:۲۳)

گلیل کے بعد آپ کفرنحوم کی بستی میں یہ منادی کرتے رہے۔ جب وہاں سے رخصت ہونے لگے تو لوگوں نے درخواست کی کہ آپ ہمارے پاس سے نہ جائیں۔آپ نے جواب دیا:

''مجھے اور شہروں میں بھی خدا کی بادشاہی کی خوش خبری سنانا ضرور ہے، کیونکہ میں اسی لیے بھیجا گیا ہوں۔'' (لوقا ۴:۴۳)

[باقی]

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

اخذ و تحریر: معظم صفدر
نظر ثانی: منظور الحسن

[جناب جاوید احمد صاحب غامدی اپنے ہفتہ وار درس قرآن و حدیث کے بعد شرکا کے سوالوں کے جواب دیتے ہیں۔ ان میں سے چند منتخب سوال و جواب تحریر میں منتقل کر کے پیش کیے جا رہے ہیں۔]

نماز میں سلام پھیرنا اور شہادت کی انگلی اٹھانا

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

سوال: نماز میں سلام پھیرنے اور جلسے میں شہادت کی انگلی اٹھانے کا پس منظر کیا ہے؟

جواب: نماز میں سلام پھیرتے وقت ہم ''السلام علیکم'' کہہ کر اصل میں نماز سے فارغ ہوتے ہیں۔ یہ بڑا پاکیزہ طریقہ ہے۔ نماز پڑھتے ہوئے ہم اللہ کے حضور میں ہوتے ہیں، اس سے نکلنے کے لیے کوئی علامت تو بہر حال ہونی چاہیے تھی۔ اس کا اس سے اچھا طریقہ کیا ہو سکتا تھا کہ جب ہم نماز مکمل کریں تو اپنے دائیں بائیں رخ کر کے اللہ کی مخلوق کے لیے سلامتی کی دعا کریں۔

جلسے میں شہادت کی انگلی توحید کی علامت کے طور پر اٹھائی جاتی ہے۔ نماز کے ارکان اصل میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہمارے تعلق کا علامتی اظہار (Symbolic Expression) ہیں۔ یہی معاملہ حج اور قربانی کے ارکان کا بھی ہے۔ یہ علامتی اظہار بڑا اہم ہوتا ہے اور عبادات میں اس سے مقصود درحقیقت ایمانیات کے مختلف اجزا کو ذہن میں قائم رکھنا ہوتا ہے۔ اس کو ایسے سمجھا جا سکتا ہے کہ ہم اپنے ملک کے جھنڈے کو سلام کرتے ہیں، ترانے کی تعظیم میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ سب چیزیں اصل میں ہمارے جذبات کا، ہماری تعظیم کا علامتی اظہار ہیں۔

(اگست ۲۰۰۴)

قیامت میں فرشتوں اور جنوں کا حساب

سوال: کیا قیامت کے روز انسانوں کی طرح فرشتوں اور جنوں کا بھی حساب ہوگا؟

جواب: جنات کے بارے میں قرآن مجید نے ہم کو بتا دیا ہے کہ وہ بھی اسی طریقے سے خیر وشر کی کشمکش میں ڈالے گئے ہیں جس طرح انسان ڈالے گئے ہیں اور یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ ان میں اچھے بھی ہیں اور برے بھی۔ ان کے انجام کے بارے میں بھی آگاہ کر دیا ہے کہ انسانوں کی طرح ان کے ساتھ بھی اچھائی اور برائی کی بنا پر معاملہ کیا جائے گا۔ مزید یہ بات بھی بتا دی ہے کہ جس طرح ہماری طرف اللہ کے پیغمبر آئے ہیں، اسی طرح ان کی طرف بھی اللہ کے پیغمبر آئے ہیں۔ اس لیے جنوں کے بارے میں تو ہم جانتے ہیں، لیکن فرشتوں کے بارے میں ایسی کوئی بات ہمارے علم میں نہیں ہے۔ البتہ، ان کے متعلق قرآن مجید سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اللہ کی حضوری میں رہتے ہیں اور اختیار رکھنے کے باوجود وہ نہ کسی گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں اور نہ اللہ کی نافرمانی کرتے ہیں۔ اس وجہ سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ قیامت میں ان کا حساب کتاب نہیں ہوگا۔ (اگست ۲۰۰۴)

بینک کی ملازمت اور سود

سوال: بنک کی ملازمت، کیا سود کی دستاویز لکھنے اور اس کی گواہی دینے کے زمرے میں آتی ہے؟

جواب: بنک کی ملازمت سود کی دستاویز لکھنے اور اس کی گواہی دینے کے زمرے میں تو یقیناً آتی ہے، لیکن موجودہ دور میں اس معاملے کو اسی طرح دیکھا جائے گا جس طرح اسلام کے ابتدائی زمانے میں غلامی کے معاملے کو دیکھا گیا تھا۔ اس وقت سود کا کاروبار ایسے ہی پھیل چکا ہے جیسے قدیم زمانے میں غلامی پھیل چکی تھی۔ اس وقت اسلام نے غلامی پر یک لخت پابندی عائد کر کے لوگوں کو کسی بڑی مشقت میں مبتلا نہیں کیا، بلکہ ایک تدریج کے ساتھ اس کے خاتمے کی راہ ہموار کی۔ پہلے اس کے راستے بند کیے اور پھر وہ قوانین بنائے جن کے ذریعے سے سوسائٹی سے اس کا خاتمہ ہو سکے۔

سود پر اسلام کو اصل اعتراض یہ ہے کہ یہ ایک اخلاقی برائی ہے۔ آپ کو قرض پر متعین منفعت لینے کا حق نہیں

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

ہے۔قرآن کے مطابق یہ درحقیقت دوسرے کا مال غلط طریقے سے کھانا ہے۔

تاہم، موجودہ دور میں اس کاروبار کی نوعیت یہ بن چکی ہے کہ پوری معیشت اس پر منحصر ہے، بینکوں کا سارا نظام اس پر چل رہا ہے۔اس لیے اس میں جن لوگوں کو کوئی ملازمت کرنا پڑتی ہے، ان کے لیے وہی قواعد ہوں گے جو غلامی کے نظام میں پھنسے ہوئے لوگوں کے بارے میں تھے۔

آدمی اگر بہتر ماحول میں جا سکے تو اس کی کوشش کرنی چاہیے اور اللہ سے عفو و درگزر کی توقع رکھنی چاہیے۔

(اگست ۲۰۰۴)

اسلام سے پہلے نماز

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

سوال: کیا اسلام سے پہلے بھی نماز پڑھی جاتی تھی؟ اگر ایسا ہے تو کیا اس میں بھی سورۂ فاتحہ اور باقی آیات ایسے ہی پڑھی جاتی تھیں جیسے اب مسلمان پڑھتے ہیں؟

جواب: نماز اصلاً رکوع، سجود، قعدے اور قیام کا نام ہے۔اس کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے، جتنی خود مذہب کی ہے۔اس کا تصور تمام مذاہب میں رہا ہے اور اس کے مراسم اور اوقات بھی کم وبیش متعین رہے ہیں۔قرآن نے بتایا ہے کہ اللہ کے تمام پیغمبروں نے اس کی تعلیم دی ہے۔ جہاں تک اس میں پڑھے جانے والے اذکار کا تعلق ہے تو اسلام سے پہلے جو الہامی کتابیں موجود تھیں، انھی کے کلمات پڑھے جاتے تھے۔یہ اذکار قدیم صحائف میں دیکھے جا سکتے ہیں۔(اگست ۲۰۰۴)

مجبوری کی وجہ سے غلط کام کا ارتکاب

سوال: انسان کو زندگی میں اگر کسی وقت حالات اس قدر مجبور کر دیں کہ صحیح بات کو جاننے کے باوجود غلط بات کو اختیار کرنا اس کی مجبوری بن جائے تو اس صورت حال میں اسے کیا کرنا چاہیے؟

جواب: اگر کوئی آدمی کسی اضطرار یا مجبوری کی وجہ سے کوئی غلط کام کرتا ہے تو خدا کی رحمت سے یہ امید رکھنی چاہیے کہ وہ اسے معاف فرما دیں گے۔ البتہ، اضطرار اور مجبوری کی کیا نوعیت ہے، اس کا ادراک ضروری ہے۔ لوگ بعض اوقات بہت معمولی باتوں کو مجبوری بنا لیتے ہیں۔ اللہ کے ہاں اس کا راز بھی کھل جائے گا۔ (اگست ۲۰۰۴)

یہود و نصاریٰ کے لیے دعا کرنا

سوال: درود ابراہیمی پڑھتے ہوئے ہم 'آل ابراھیم' کے الفاظ ادا کرتے ہیں، جس سے یہ یہودیوں اور عیسائیوں کے لیے بھی دعا بن جاتی ہے، اس لحاظ سے درود ابراہیمی کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب: یہودیوں اور عیسائیوں کے لیے دعا کرنے میں کیا حرج ہے۔ ان کے نیک لوگوں کے لیے ہم کو دعا ہی کرنی چاہیے۔ وہ بھی اللہ کے دین کو ماننے والے ہیں اور ہمارے بھائی ہیں۔ ان میں سے جو لوگ جانتے بوجھتے حق کا انکار نہیں کر رہے، ان کے لیے ہم دعا کیوں نہیں کریں گے! (اگست ۲۰۰۴)

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

انسانوں کی آزمایش کی حکمت

سوال: اللہ تعالیٰ عالم الغیب ہے۔ کیا وہ انسانی مزاج کو نہیں جانتا پھر اسے امتحان لینے کی کیا ضرورت ہے؟

جواب: اللہ تعالیٰ نے یہ امتحان اپنے لیے نہیں لیا، بلکہ آپ کے لیے لیا ہے، تاکہ آپ کو استحقاق کی بنا پر اجر دے سکے۔ اگر وہ اپنے علم کی بنیاد پر فیصلہ کر دیتا تو آپ قیامت میں اس کی عدالت میں مقدمہ لے کر کھڑے ہو جاتے کہ آپ نے موقع تو دیا ہی نہیں تھا۔ چنانچہ جان رکھیے کہ یہ ساری آزمایش آپ کے استحقاق کو قائم کرنے کے لیے ہے۔ (اگست ۲۰۰۴)

معصوم لوگوں کا نمونۂ عبرت بنایا جانا

سوال: بعض اوقات اللہ تعالیٰ بے گناہ اور معصوم لوگوں کو دوسروں کے لیے عبرت کا نمونہ بنا دیتے ہیں۔ جنھیں عبرت بنایا گیا ہے، ان کا کیا قصور ہے؟

جواب: یہ دنیا انصاف کے اصول پر نہیں، بلکہ امتحان کے اصول پر قائم کی گئی ہے۔ انصاف کے اصول پر قائم ہونے والی دنیا قیامت کے بعد ظہور پذیر ہو گی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ اس دنیا میں ظلم بھی ہو گا، زیادتی بھی ہو گی اور کسی کو عبرت بھی بنایا جائے گا، یہ سب معاملات اسی طرح ہوں گے، کیونکہ یہ سب امتحان کے لیے ہے۔ اگر آپ اس میں کامیاب ہو گئے تو انصاف آپ کا منتظر ہے۔ اُس دنیا میں انصاف حاصل کیجیے اور اِس کو امتحان سمجھ کر زندگی بسر کیجیے۔ (اگست ۲۰۰۴)

اسلام کا زبان سے اقرار اور عمل سے نفی کرنا

سوال: زبان سے کلمۂ اسلام کا اقرار اور عمل سے اس کی نفی کرنے والے کو کیا کہیں گے؟

جواب: کہنے کی ضرورت کیا ہے؟ یعنی کیا یہ ضروری ہے کہ ایسے شخص پر لازماً کوئی فتویٰ لگایا جائے۔ اگر کوئی آدمی کوتاہی کر رہا ہے تو ہمیں اپنے بھائی کو اس کوتاہی سے نکالنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اسے بھلائی کی طرف دعوت دینی چاہیے، اس تک اللہ کا پیغام پہنچانا چاہیے۔ اس کے بارے میں فتویٰ صادر کرنے سے گریز کرنا چاہیے۔

(اگست ۲۰۰۴)

خاوند سے پوچھے بغیر خرچ کرنا

سوال: خاوند اگر سخت مزاج، بلکہ بدمزاج ہو تو کیا یہ ٹھیک ہے کہ بیوی اس کی کمائی کو گھریلو اخراجات

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

کے لیے اس سے پوچھے بغیر استعمال کرسکتی ہے؟ یہ عمل چوری کے زمرے میں تو نہیں آ جاتا؟

جواب: بیوی کے نان ونفقے کی ذمہ داری شوہر پر ڈالی گئی ہے۔ ایک بار جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسا ہی سوال پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ تم اپنے خرچ کے برابر لے سکتی ہو۔ اس کو چوری نہیں کہا جائے گا۔ یہ شوہر پر تمھاری ذمہ داری ہے۔

مگر، اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ آپ اس رعایت سے فائدہ اٹھالیں اور جو جی چاہے کرنا شروع کر دیں۔

(اگست ۲۰۰۴)

زکوٰۃ یا ٹیکس

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

سوال: زکوٰۃ اسلامی حکومت کا ٹیکس ہے، ہماری حکومت خالصتاً اسلامی نہیں اور نہ وہ ہم سے وصول کیے ہوئے ٹیکس کو زکوٰۃ کے آٹھ مصارف پر خرچ کرتی ہے، تو پھر ہم کیسے سمجھ لیں کہ ہماری زکوٰۃ ادا ہوگئی ہے؟

جواب: ٹیکس کو خرچ کرنا حکومت کا کام ہے۔ آپ جس کو اسلامی حکومت کہتے ہیں وہ بھی جب قائم ہو جائے گی تو کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کتنا صحیح خرچ کرے گی اور کتنا غلط، کیونکہ ہر حکومت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کی حکومت نہیں ہوتی۔ اس لیے آپ کی ذمہ داری یہ ہے کہ آپ اپنا فرض پورا کریں اور حکومت کو تلقین اور نصیحت کریں کہ وہ اپنے رویے ٹھیک کرے۔

زکوٰۃ کو ٹیکس کی حیثیت سے حکومت کو ادا کر کے باقی ٹیکسوں سے خود کو بری سمجھنا ایک اجتہادی رائے ہے، اگر آپ کا اس پر اطمینان نہیں ہوتا تو آپ دوسری صورت اختیار کر سکتے ہیں، یعنی ٹیکس بھی ادا کر دیں اور زکوٰۃ بھی۔

(اگست ۲۰۰۴)